بہار کی طرح
خوشگوار!

تبت کے نفیس و لطیف ٹالکم پاؤڈر
جسم کو پھولوں کی طرح ملائم اور معطّر رکھتے ہیں۔
اِن کی فرحت بخش تاثیر اور دلکش مہک گرمیوں میں
بہار کی خوشگوار یاد تازہ کرتی ہے۔

رائل روز ٹالک

لِونڈر ٹالک
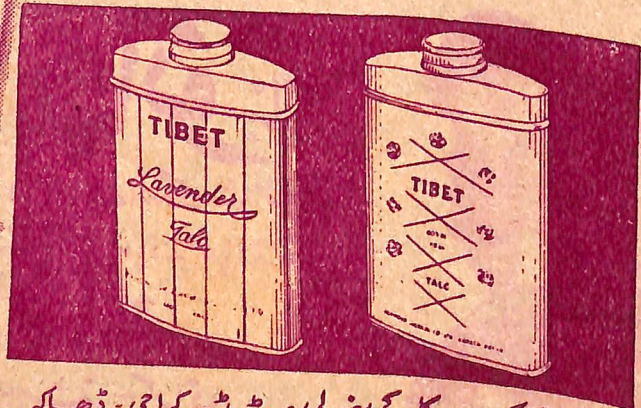
کوہِ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ - کراچی - ڈھاکہ
آرائش جمال کی معیاری مصنوعات تیار کرنے والے

راجندر سنگھ بیدی
افکار (کراچی)

کہانی اور مسافر

میں نے ماما کو پتھر کے ایک برتن میں مکھن رکھتے ہوئے دیکھا۔ پھر اُس نے چھاچھ کی کھٹاس دور کرنے کے لئے کنوئیں کے تازہ پانی سے مکھن کو کئی بار دھویا اس اہتمام سے مکھن تیار کرنے کا یقیناً کوئی خاص سبب ہوگا اور مجھے یاد آیا کہ جب ماما کا کوئی رشتہ دار آنے والا ہوتا ہے تو وہ اسی اہتمام سے مکھن تیار کرتی ہے اور اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ دو دن بعد ماما کا بھائی اپنی بیوہ بہن سے راکھی بندھوانے کے لئے آنے والا ہے، یوں تو عام طور سے بہنیں اپنے بھائیوں کے گھر جا کر انہیں راکھی باندھتی ہیں۔ لیکن ماما کا بھائی اپنی بہن اور بھانجے سے ملنے کی غرض سے خود آ جایا کرتا تھا اور راکھی بندھوا لیا کرتا تھا۔ راکھی بندھوا کر وہ اپنی بیوہ بہن کو یہ یقین دلانے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ گو اس کا سہاگ لٹ چکا ہے لیکن جب تک اس کا بھائی زندہ ہے اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتا ہے۔

ننھے بھولا نے میرے خیال کی تصدیق کر دی اُس نے گنّا چوستے ہوئے کہا۔ ”بابا۔ پرسوں ماما جی آئیں گے نا؟“

میں نے اپنے پوتے کو پیار و چمکار کر گود میں اٹھا لیا۔ بھولا کا جسم بے حد نرم اور کومل تھا۔ اس کی آواز انتہائی سریلی تھی۔ گویا کنول کی تیلیوں کی سفیدی اور نزاکت۔ گلاب کی سُرخی اور بلبل کی دلکش آواز کو یکجا کر دیا گیا ہو۔ گو کہ بھولا میری لانبی اور گھنی داڑھی سے ڈر کر مجھے اپنا منہ چومنے کی اجازت نہیں دیا کرتا تھا۔ پھر بھی میں نے جبراً اُس کے سُرخ تمتماتے رخساروں کو چوم لیا۔ اور مسکرا کر کہا۔ ”بھولے۔ تیرے ماما جی بھلا تیری ماتا جی کے کون ہوتے ہیں؟“

بھولے نے ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد جواب دیا — ”ماما جی“

مایا نے گیتا پڑھنا بند کر دیا اور کھِل کھِلا کر ہنس پڑی۔ میں اپنی بہو کو اس طرح خوش و خرم اور ہنستا دیکھ کر بے حد خوش ہوا — مایا بیچاری بیوہ تھی اور سماج اُسے اچھے کپڑے پہننے کے علاوہ ہنسنے اور خوشی کی باتوں میں حصہ لینے سے بھی روکتا تھا۔ میں نے کئی بار مایا کو اچھے کپڑے پہننے، ہنسنے بولنے اور سماج کی پروانہ کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن مایا نے ہنسی خوشی خود کو سماج کے دم گھونٹ دینے والے اصولوں اور احکام کا پابند بنا لیا تھا۔ اس نے اپنے تمام قیمتی کپڑوں اور زیورات کو ایک صندوق میں بند کر کے اس کی کنجی قریبی جوہڑ میں پھینک دی تھی۔

مایا نے اپنے لال کو پیار سے اپنے قریب بُلا کر پوچھا — ”بھولے۔ تم منّی کے کون ہوتے ہو؟“

”بھائی“، بھولا نے فوراً جواب دیا۔

”اسی طرح تیرے ماما جی میرے بھائی ہیں۔“

لیکن بھولا یہ نکتہ نہ سمجھ سکا کہ ایک ہی شخص کس طرح ایک ہی وقت میں کسی کا بھائی اور کسی کا ماما ہو سکتا ہے۔ وہ تو اب تک یہی سمجھتا تھا کہ اس کے ماما جی اس کے باپ کے بھی ماما جی ہیں۔ بہر حال بھولا نے اس ماما اور بھائی کے جھگڑے میں پڑنے کے بجائے ماں کی گود میں بیٹھ جانا پسند کیا اور وہ اُچک کر اس کی آغوش میں بیٹھ گیا اور اپنی

ماں سے گیتا سُنانے کی فرمائش کرنے لگا۔ وہ گیتا صرف اس لئے سنتا تھا کہ وہ کہانیوں کا شوقین تھا۔

مجھے دوپہر کو اپنے گھر سے چھ میل کے فاصلہ پر اپنے کھیتوں پر ہل پہنچانا تھا۔ بوڑھا اور مصیبتوں کا مارا ہوا جسم۔ اپنی جوانی میں تو میں تین تین من کا بوجھ اٹھالیا کرتا تھا لیکن اب تو بیس سیر وزن کے نیچے گردن ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اکلوتے بیٹے کی بے وقت موت نے کمر توڑ دی تھی۔ اور میں صرف بھولا کے جوان ہونے کے سہارے زندہ تھا ورنہ سچ تو یہ ہے کہ میں مر چکا تھا۔

رات کو تھکان کے سبب میں بستر پر لیٹتے ہی اونگھنے لگا۔ کچھ دیر بعد مایا نے مجھے دودھ پینے کے لئے آواز دی۔ میں بہو کے سلیقے، سگھڑاپے اور خدمت گذاری سے بہت خوش ہوا اور اُسے سیکڑوں دعائیں دیتے ہوئے میں نے کہا "مجھ بوڑھے کی اتنی فکر نہ کیا کر بیٹی"۔

بھولا ابھی تک سویا نہ تھا۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور میری پشت پر سوار ہو گیا۔ اس نے کہا "بابا جی، کیا آج آپ کہانی نہیں سنائیں گے؟"

"نہیں بیٹا"۔ میں نے آسمان میں جھلملاتے ہوئے تاروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں آج بہت تھک گیا ہوں۔ کل دوپہر کو تمہیں اچھی سی کہانی سناؤں گا"۔

"تو میں تمہارا بھولا نہیں بابا۔ میں ماتا جی کا بھولا ہوں"۔ بھولا نے روٹھ کر کہا۔

بھولا جانتا تھا کہ میں اس کی اس قسم کی بات کبھی برداشت نہیں کرتا۔ میں اس کے منہ سے ہمیشہ یہی سننے کا عادی تھا کہ وہ بابا کا بھولا ہے ماتا جی کا نہیں لیکن اس دن ہل کو کاندھے پر رکھ کر چھ میل لے جانے اور پیدل ہی واپس آنے کی وجہ سے میں بہت تھک گیا تھا شاید میں اتنا نہ تھکتا اگر میرا اپنا جوتا میری ایڑی کو نہ دباتا اور میرے پاؤں میں ٹیسیں نہ اٹھتیں ـــ اس لئے میں نے بھولا کی یہ بات بھی سہہ لی اور آسمان میں تاروں کے جھرمٹ کو دیکھنے لگا۔ آسمان کے جنوبی گوشہ میں ایک تارا مشعل کی مانند چمک رہا تھا لیکن میرے کچھ دیر تک ایک ٹک دیکھنے کے بعد وہ مدھم ہوتا نظر آیا ـــ اور میں اونگھتے ہوئے سو گیا۔

صبح اٹھتے ہی مجھے خیال آیا کہ بھولا سوچتا ہو گا کل رات بابا نے میری بات کس طرح برداشت کر لی۔ یہ خیال آتے ہی میں کانپ اٹھا کہیں بھولا کے ننھے دل میں یہ بات نہ بیٹھ جائے کہ اب بابا کو اس کی پرواہ نہیں رہی۔ میرا وسوسہ صحیح نکلا۔ بھولا نے میرے بلانے کے باوجود میری آغوش میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ "میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا بابا"۔ اس نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیوں بھولے؟"

"بھولا اب باباجی کا نہیں ہے۔ بھولا ماتا جی کا ہے"۔

میں نے مٹھائی کا لالچ دے کر اُسے منالیا اور چند ہی لمحوں بعد بھولا دوبارہ باباجی کا بن گیا اور اچھل کر میری چارپائی پر لیٹ گیا اور اپنی ننھی ٹانگوں سے گرد میرا کمبل لپیٹنے لگا۔ مایا مکھن تیار کرنے میں مشغول تھی اور اپنے بھائی کے لئے تقریباً ایک سیر مکھن نکال چکی تھی۔ بھائی بہن کی باہمی محبت کے اس مظاہرے پر میرا دل خوشی سے ناچ اٹھا۔ میں نے سوچا۔ عورت کا دل پریم کا ایک اتھاہ سمندر ہوتا ہے۔ ماں باپ بھائی بہن۔ شوہر اور اولاد۔ وہ سب ہی کو پیار کرتی ہے۔ اور پھر بھی اس کے سینہ میں موجیں مارتا ہوا پریم کا ساگر ختم نہیں ہوتا۔ ایک دل کی مالک ہوتے ہوئے بھی وہ ان سب کو اپنا دل دے بیٹھتی ہے ـــ !

بھولا نے میرے گلے میں باہیں ڈال کر کہا "بابا۔ تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟"

"کون سا وعدہ بیٹے؟"

"وہی کہ آج دوپہر کو مجھے کہانی سناؤ گے"۔

"ہاں بیٹا۔ یاد ہے"۔ میں نے اس کا منہ چوم لیا۔

یہ تو خیر بھولا ہی جانتا ہو گا کہ اس نے دوپہر کی آمد کا کس بے چینی سے انتظار کیا ہو گا۔ بھولا کو یہ تو معلوم ہی تھا کہ باباجی کے کہانی سنانے کا وقت وہی ہوتا ہے جب وہ کھانا کھا کر اپنی چارپائی پر لیٹ جاتے ہیں۔ بس بیچارہ باباجی یا ماتا جی کے سہارے کے بغیر نہیں چڑھ سکتا ہے۔ لہٰذا وہ معمول سے ایک

گھنٹہ قبل ہی کھانا نکالنے کے لئے ضد کرنے لگا۔ میرے کھانے کے خیال سے نہیں بلکہ کہانی جلد سُن لینے کے خیال سے!

میں نے معمول سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی کھانا کھا لیا لیکن ابھی آخری نوالہ میرے ہاتھ ہی میں تھا کہ پٹواری نے دروازے پر دستک دی۔ اس گاؤں میں زمین کی پیمائش کرنے والا یہ کافیتہ تھا اس نے کہا کہ خانقاہ کے کنوئیں کے قریب والی میری زمین کی پیمائش کر سکتے تھے آج ہی فرصت ملی ہے اور پھر شاید کئی ہفتوں تک موقع نہ مل سکے۔ میں نے دالان کی سمت نظریں اٹھائیں تو دیکھا کہ بھولا چارپائی کے چاروں طرف گھوم کر میرا بستر ٹھیک کر رہا ہے۔ بستر بچھانے کے بعد اس نے ایک بڑا سا تکیہ بھی سرہانے رکھ دیا اور خود چارپائی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے پٹواری سے کہا کہ وہ کنوئیں پر چلے میں کچھ دیر میں وہیں آ جاؤں گا۔ جب بھولا نے یہ سنا کہ میں باہر جانے والا ہوں تو اس کا چہرہ اس طرح مدھم پڑ گیا جس طرح پچھلی رات کو آسمان کے جنوبی گوشہ میں مشعل کی مانند چمکتا ہوا ستارا لگاتار دیکھنے سے مدھم پڑتا نظر آیا تھا۔

ماما نے کہا، بابا جی۔ اب ایسی بھی کیا عجلت ہے۔ خانقاہ کے کنوئیں والی زمین کہیں بھاگی تو نہیں جاتی۔ آپ کچھ دیر آرام تو کر لیں۔"

"پٹواری چلا گیا تو پھر یہ کام ایک ماہ سے قبل نہ ہو سکے گا" میں نے آہستہ سے کہا۔

ماما خاموش ہو گئی لیکن بھولا منہ بسورنے لگا اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اس نے رندھے ہوئے لہجہ میں کہا "بابا میری کہانی۔ میری کہانی"

"بھولے میرے بچے" میں نے اسے ٹالنے کے خیال سے کہا "دن کے وقت کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں"

"راستہ بھول جاتے ہیں؟" بھولا نے سوچتے ہوئے کہا "بابا۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ جانتے ہیں بابا جی — کا بھولا نہیں بنتا"

اس وقت جبکہ میں کل کی مانند تھکا ہوا بھی نہ تھا اور آرام کرنے کے لئے دس پندرہ منٹ با آسانی نکال سکتا تھا میں بھولا کا یہ دلشکن جملہ کیونکر برداشت کر لیتا۔ لہٰذا میں نے اپنے کاندھے سے چادر اتار کر چارپائی کی پائینتی ڈال دی اور اپنی ایڑیوں کو تکلیف دہ جوتے سے نجات دلا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ بھولا فوراً اپنے بابا جی کا بن گیا۔ تکیہ درست کرتے ہوئے میں نے کہا "میں کہانی سنائے دیتا ہوں لیکن کوئی مسافر اگر راستہ بھول جائے تو تم ذمہ دار ہوں گے"

اور میں نے بھولا کو سات شہزادوں اور شہزادیوں کی ایک طویل کہانی سنائی۔ یہ کہانی بھولا کو بہت پسند تھی اور کہانی کے آخری حصہ میں شہزادوں اور شہزادیوں کی شادی ہو جانے پر وہ ہمیشہ بڑی خوشی کا اظہار کیا کرتا تھا لیکن آج اس کے چہرے سے کسی مسرت کا اظہار نہ ہوا بلکہ وہ اداس چہرہ لئے خاموش بیٹھا رہا۔

شام کو جب میں زمین کی پیمائش سے فارغ ہو کر گھر واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ بھولا دالان میں کود رہا ہے۔ لکڑی کے ایک ڈنڈے کو گھوڑا بنا کر وہ اس پر سوار تھا اور کہہ رہا تھا۔

"چل ماماجی کے دیس رے گھوڑے ماماجی کے دیس"

جونہی اس نے مجھے دیکھا اپنا گانا بند کر کے اس نے مجھ سے کہا "بابا۔ آج ماماجی آئیں گے نا؟"

"ماماجی آئیں گے تو پھر کیا ہوگا بھولے" میں نے پوچھا۔

"ماماجی میرے لئے اگن بوٹ لائیں گے۔ ماماجی کتابیں لائیں گے۔ ماماجی کے سر پر مکئی کے بھٹوں کا گٹھڑ ہوگا۔ بابا ہمارے ہاں تو مکئی ہوتی ہی نہیں اور بابا ماماجی ایسی مٹھائی لائیں گے جو آپ نے خواب میں بھی نہ کھائی ہوگی"

میں سوچنے لگا کہ کتنی ذہانت سے بھولا نے سات شہزادوں کی کہانی سے "خواب میں بھی نہ کھائی ہوگی" والا جملہ یاد کر لیا ہے۔

"جیتے رہو بیٹے۔ تم یقیناً ہونہار ہو اور ہمارے خاندان کا نام روشن کرو گے"

شام ہوتے ہی بھولا دروازے پر جا بیٹھا جیسے جیسے رات کی تاریکی گہری اور چراغ کی روشنی تیز ہوتی گئی ماما نے فکرمند لہجہ میں کئی بار کہا

"بابا۔ بھیا ابھی تک نہیں آئے!"

"کسی ضروری کام کی وجہ سے رُک گئے ہوں گے۔"

"کام کی وجہ سے؟"

"ہاں ممکن ہے کوئی بہت ضروری کام آگیا ہو۔ تیرے راکھی کے روپے منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دیں گے۔"

"لیکن راکھی؟"

"ہاں راکھی؟ ۔ انہیں اب تک تو آجانا چاہیئے تھا۔"

میں نے جبراً بھولا کو دروازے کی دہلیز سے ہٹایا اس کی ماں سے زیادہ فکر مند لہجہ میں پوچھا۔

"باباجی۔ ماماجی کیوں نہیں آئے؟"

مایا نے بھولا کو گود میں اٹھا کر چمکارتے ہوئے کہا "شاید صبح آجائیں تیرے ماماجی"

"میرے ماماجی تمہارے کون ہوتے ہیں ماں؟" بھولا نے ماں کی گردن میں باہیں ڈال کر پوچھا۔

"وہی جو تم ننھی کے ہوتے ہو"

"یعنی بھائی!"

"ہاں!"

"اور منی کے کیا ہوتے ہیں" اس نے اپنے ایک ہم عمر دوست کا نام لیکر پوچھا۔

"کوئی نہیں"

"بھائی بھی نہیں؟"

"نہیں!"

اور بھولا اس عجیب بات پر غور کرتا ہوا سوگیا۔ جب میں اپنے بستر پر لیٹا تو آسمان کے جنوبی گوشہ میں مشعل کی مانند چمکنے والا ستارا کچھ ماند ہوتا ہوا محسوس ہوا اور مجھے فوراً ہی بھولا کا اترا ہوا چہرہ یاد آگیا جو میرے باہر جانے کی تیاری کرتے دیکھ کر اسی طرح ماند پڑ گیا تھا۔ کتنا شوق ہے بھولا کو کہانیاں سننے کا!۔

مایا کا بھائی ابھی تک نہیں آیا تھا۔ شاید نہ آئے۔ میں نے سوچا۔ اسے کم از کم اپنی بہن کا بڑے چاؤ سے تیار کیا ہوا مکھن کھانے کے لئے تو آجانا چاہیئے تھا۔ میں تاروں کو ایک ٹک دیکھتے دیکھتے اونگھنے لگا تھا کہ دفعتاً بھولا آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ اس نے اٹھتے ہی پوچھا۔ ماماجی ابھی تک کیوں نہیں آئے؟"

"آجائیں گے بیٹا۔ تم سو جاؤ۔ وہ منہ اندھیرے آجائیں گے۔"

اپنے بیٹے کو بے تاب دیکھ کر مایا بھی مضطرب سی نظر آنے لگی بالکل اسی طرح جیسے ایک چراغ سے دوسرا چراغ جل اٹھتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ بھولا کو لٹا کر آہستہ آہستہ تھپکنے لگی۔ مایا کی آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ یوں بھی جوانی میں نیند کا زور ہوتا ہے اور چونکہ مایا دن بھر کے کام کاج سے تھکی ہوئی تھی لہذا بڑی گہری نیند سویا کرتی تھی۔ میری نیند تو عام بوڑھوں جیسی تھی۔ ایک آدھ گھنٹہ سو لیتا تو دو گھنٹہ جاگتا رہتا اور بقیہ رات تارے گن گن کر کاٹ دیتا۔ لہذا میں نے مایا سے کہا کہ وہ سو جائے اور بھولا کو میرے پہلو میں لٹا دے۔

"بتی جلتی چھوڑ دو البتہ تھوڑی دھیمی کر دو۔ میلہ کی وجہ سے بہت چور اچکے ادھر ادھر گھومتے پھر رہے ہیں" میں نے اونگھتی ہوئی مایا سے کہا۔

اس بار میلہ کے دوران چھوٹے بچوں کے اغوا کی کئی وارداتیں ہو چکی تھیں اس لئے میں نے حفاظت کے خیال سے بھولا کو اپنے پہلو میں سلا لیا تھا۔ کچھ دیر بعد میری بھی آنکھ لگ گئی۔

کچھ دیر بعد جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا طاق پر بتی نہیں ہے۔ میں نے گھبرا کر اندھیرے میں ہاتھ آگے بڑھایا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ بھولا بھی بستر پر نہ تھا۔ میں نے اندھوں کی مانند دیوار اور کھمبوں سے ٹکرا کر تمام چارپائیاں دیکھ ڈالیں۔ مایا کو بھی جگا دیا۔ لیکن بھولا کا کہیں پتہ نہ تھا۔

"مایا ہم لٹ گئے" میں نے اپنا سر پیٹ کر کہا۔

مایا ماں تھی اس کے دل کی کیا حالت تھی اس کا اندازہ تو کچھ اسی کو ہو سکتا ہے جس کا بیوگی کے عالم میں اکلوتا بیٹا غائب ہو جائے۔ مایا نے اپنا سہاگ لٹنے پر اتنا بین نہ کیا ہوگا جتنا اس وقت کیا۔ وہ پاگلوں کی مانند چیخ رہی تھی اور اپنے سر کے بال نوچ رہی تھی۔ پڑوس کی عورتیں اس کی چیخ پکار سن کر آگئیں اور اس کے ساتھ آہ و بکا میں مشغول ہو گئیں۔

میں عورتوں سے زیادہ رو پیٹ رہا تھا۔ آج ہی شام کو میں نے ایک مداری کو اپنے گھر کے اندر جھانکتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس وقت میں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی تھی۔ میں نے بھگوان سے بڑی تھا کی منتیں مانیں کہ میرا بھولا مل جائے وہی اس گھر کا اجالا ہے۔ میرے بڑھاپے کی لاٹھی ہے۔ میں اور مایا اسی کے جوان ہونے کی امید کے سہارے زندہ تھے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ مایا بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ مڑے ہوئے تھے اور رگیں تنی ہوئی تھیں۔ عورتیں اس کی ناک دبا کر چمچہ کے ذریعہ اس کے منہ میں پانی ٹپکانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

مایا کی یہ حالت دیکھ کر ایک لمحے کے لئے میں بھولا کو بھی بھول گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی ہے۔ ایک ساتھ جب گھر کے دو فرد چل بسیں تو دل کی کیا حالت ہو سکتی ہے؟ میں نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے بھگوان کو برا بھلا کہا کہ اس نے مجھے یہ دردناک منظر دکھلانے سے پہلے خود مجھے کیوں نہ اٹھا لیا۔

میرا جسم لرز اٹھا اور میں بھی مایا کے مانند بے ہوش ہو کر گرنے ہی والا تھا کہ مایا کو ہوش آ گیا۔ میری جان میں جان آئی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں خود ہی اپنی حالت ایسی غیر کر لوں گا تو مایا تو عورت ذات ہے اس کی ڈھارس کون بندھائے گا۔ میں نے اپنے بکھرے ہوئے حواس جمع کر کے کہا، مایا بیٹی۔ صبر سے کام لو۔ بڑھاپے میں مجھے یوں برباد نہ کرو۔ چھوٹے بچوں کو اکثر اغوا کر لیا جاتا ہے لیکن بعد میں وہ ضرور مل جاتے ہیں۔ مداری لوگ بچوں کو مار ڈالنے کے لئے اغوا نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے جوان ہونے پر اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے ساتھ رکھتے ہیں۔ اطمینان رکھو ہمارا بھولا ضرور مل جائے گا"

اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی۔ لیکن ہمارے چند پڑوسی اسی وقت تھانے میں بھولا کی گمشدگی کی اطلاع دینے کے لئے روانہ ہو گئے۔ تھانہ ہمارے گاؤں سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر تھا۔ اور ہم لوگ امید و بیم کے عالم میں صبح کا انتظار کرنے لگے۔ شاید صبح کے اجالے میں کوئی ترکیب سوجھے۔!

دفعتاً دروازہ کھلا اور ہم سب نے بھولا کے ماما کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کی گود میں بھولا تھا! اس کے سر پر مٹھائی کی ٹوکری اور ہاتھ میں لالٹین تھی۔ مایا نے نہ تو بھائی کی خیر و عافیت پوچھی نہ دیر سے آنے کی وجہ، جھپٹ کر بھائی کی

گود سے بھولا کو لے لیا اور ــــ سینہ سے لگا کر اس کے رخساروں پر بوسوں کی بارش کر دی۔

بھولا کے ماما نے کہا "مجھے ایک ضروری کام کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ دیر سے روانہ ہونے کے سبب میں یہاں پہنچ کر اندھیرے میں راستہ بھول گیا اور ادھر ادھر صحیح راستہ کی تلاش میں چکر کاٹنے لگا، دفعتاً مجھے ایک سمت روشنی نظر آئی جو آہستہ آہستہ میری جانب بڑھ رہی تھی۔ میں روشنی کی جانب بڑھا اور سڑک پر پہنچ کر جب میں نے اس اندھیاری رات میں بھولا کو ہاتھ میں لالٹین پکڑے کانٹوں سے الجھتے دیکھا تو مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ جب میں نے بھولا سے پوچھا کہ وہ آدھی رات کو تنہا وہاں کیوں آیا تو اس نے جواب دیا کہ باباجی نے آج دوپہر کو مجھے کہانی سنائی تھی اور کہا تھا کہ دن کے وقت کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ تو جب تمہیں یہاں آنے میں دیر ہو گئی تو میں نے یہی سمجھا کہ تم راستہ بھول گئے۔ اور چونکہ باباجی نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر کوئی مسافر راستہ بھول گیا تو تم ذمہ دار ہو گے اس لئے میں لالٹین لے کر ــــ!

ابوالفضل صدیقی نقوش (لاہور)

خلش

کیا کہنے! کیا معقول جواب آیا میرے اس مراسلہ کا۔

چونکہ وقت مقررہ سے آپ لوگ پورے بارہ روز لیٹ ہو چکے ہیں، یوں بھی پروگرام بے وقت بنا تھا اور اب تو اواخر مارچ آ لگا، گرمی ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ گئی لہٰذا اب آئندہ سیزن کے لئے ملتوی کر دیجئے --- ۳۰ مارچ

اطلاعاً تحریر ہے کہ ہم لوگ مع چند مواقر مہمانوں کے کل دوپہر یقینی طور پر پہنچ رہے ہیں۔ لنچ وہیں کیمپ پر ہو گا۔ نیز یہ کہ ہم کو پروگرام یاد نہ رہا تھا آج آپ کے خط پر خیال آیا۔

۳۱ مارچ

اور مجھے ان صاحبزادگان سے زیادہ اپنی حماقت پر غصہ آ رہا تھا۔ کہ بیٹھے بٹھلائے دیوانہ کے ہاتھ میں اینٹ تھما دی نہ یہ لکھتا کہ مت آؤ اور نہ یہ آتے، اور پھر غور کیا تو یک نہ شد دو شد، چند مواقر مہمان بدنصیب اس تپتے ہوئے جنگل میں اور گھسیٹے جا رہے ہیں اور مہمانوں کی وجہ سے جتنا کام اور ذمہ داری بڑھے گی وہ مجھ کم بخت کے سر پڑے گی، خود ہی کیا کم تھے اور مہمان ساتھ باندھ کر لا رہے ہیں۔ بھلا پہلی اپریل کو شکار کھیلنے کے لئے اور مہمانوں کے ساتھ آنا کون سی عقلمندی ہے۔ میں نے تو اسی خیال سے ضابطہ کی اطلاع دی تھی کہ کل ہی کیمپ اکھیڑ کر گھر چل دوں گا۔ بھلا ان الھڑ نوجوانوں کو کون سمجھائے۔ چڑھتی گرمی ہے، ہر گھنٹہ میں بڑھ رہی ہے آج کا دن کل سے اور کل کا دن پرسوں سے زیادہ گرم تھا، مچھروں کا بس نہیں کہ ایک ہی رات میں سب چوس ڈالیں، مچھردانی تک کھسوٹے پھینکتے ہیں۔ اور سب کچھ غور کرنے کے بعد میں نے حکم دیا کہ کیمپ یہاں سے اکھیڑ کر ڈاک بنگلہ کے کمپاؤنڈ میں لگایا جائے تاکہ دوپہر میں کمروں کے اندر آرام مل سکے حالانکہ کمرے بھی کیا تھے دیواریں چھت کل تعمیر لکڑی اور بانس کی اور پھر بھی، تاہم کیمپ سے بہتر تھے اور چھوٹے چھوٹے انتظامات کئے۔ خاص طور پر مہمانوں کی آمد کو بد نظر رکھتے ہوئے ہر چیز پر خاص توجہ دینی پڑی۔

نڈر شام کو بیرا اور خانساماں دونوں جمع ہو کر میرے پاس آئے اور بہت ڈرتے ڈرتے کہا کہ مرغی، انڈا، اور ہر قسم کی جنس جملہ اشیاء بہ افراط موجود ہیں مگر بڑا گوشت خراب ہو گیا اور کل لنچ پر کباب پسندہ وغیرہ قیمہ کی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔"

میرے جی میں آیا کہ سر پیٹ لوں، اور پھر ساری جھونٹ انہیں پر اتار دی "بے ایمانو، تم دونوں خوب جانتے ہو کہ صاحبزادگان بغیر کباب کے

نوالہ نہیں اٹھاتے ہیں، اللہ تمہیں غارت کرے، نمک حراموں، سؤرو، یہ وقت تھا اطلاع دینے کا دن منڈے؟"

"پہلے تو حضور ہم تمام دن کیمپ کی اکھیڑ پچھاڑ میں لگے رہے اور پھر حضور کل سے گرمی کی وہ دھمک پڑی ہے کہ برف میں لگے ہونے کے باوجود بھی چل گیا پورا دس سیر گوشت۔"

بہت اچھا ہوا چل گیا۔ میں گیا گروں، کل لنچ پر مزہ معلوم ہو جائے گا، میں تو صاف کہہ دوں گا کہ حرام خوروں نے گوشت خراب کر دیا۔ اور مجھ کو شام کو بتایا، ورنہ کچھ انتظام کرتا۔"

"حضور گوشت تو گوشت ہی ہے، کچھ گیہوں چنا تو ہے نہیں غور فرمایئے لاکھ برف میں لگا ہوا سہی آج دو ہفتہ کٹے ہوئے ہو گئے کہاں تک ساتھ دے اس چڑھتی گرمی میں۔"

"ارے حرام خور، سؤرو، میں یہ کب کہتا ہوں، وہ تو ٹھیک ہے، لیکن ذرا دن سے بتلا دیتے تو کچھ مار لاتا، اب کیا کل اپنی ٹانگ کاٹ کر کباب دو گے؟ ایں، آں، اُوں، ہوں، وہ کچھ نہیں میں تو تم کو سامنے پیش کر کے علیحدہ ہو جاؤں گا اور کہہ دوں گا کہ مجھ کو اطلاع نہیں دی، ورنہ میں ذرا دیر میں کوئی چیز مار لاتا۔ اُوں، اور حرام زادو، اور شکار تو پیچھے کریں گے پہلے تمہارا ہی قیمہ کر دیں گے۔"

"مگر حضور ہمارا قصور بھی کیا، ابھی دوپہر شامی کباب بنائے ہیں، کوئی بات نہ تھی، آپ نے کھائے ہی جو ہیں۔ ابھی ابھی اس وقت یکدم محسوس ہوا کہ چل گیا اور کل دوپہر تک بو دے جائے۔"

"خوب کیوں؟"

"اور میں نے عرض کیا نہیں حضور، آخر کو گوشت ہے اور آج دس بارہ روز کا رکھا ہوا ہے، لاکھ برف سہی، پھر موسم کون آ لگا۔"

"اور یہ بات بھی ہے اور یہ بھی کہ آج کیمپ یہاں سے واں منتقل کرنے میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے فرج بند ہو گیا اور بس حضور اتنی ہی دیر میں یہ چل گیا۔"

"اور حضور جانتے ہی ہیں کہ برف کی لگی چیز جہاں ذرا برف سے ہٹی اور گئی۔"

"اچھا خیر اس سے کہہ دو شکاری خاں سے کہ آدھی رات کھسے مجھے جگا لے، چاند کی آخری تاریخیں ہیں، پچھلے پہر چاندنی پسار لیتی ہے، اب تو اندھیرا ہو گیا ذرا دیر پہلے تو کوئی بات نہ تھی کوئی چیتل جھانگ ٹٹول لاتا۔ اور تمہیں تو کل ڈیڑھ دو بجے لنچ پر دینا ہے، اور میں انشاءاللہ صبح کی چائے کے وقت پرے کر پلٹ بھی آؤں گا۔"

شکاری خاں کے جگانے پر میں اٹھا مگر ترنگ مار کر نہیں جیسا کہ بالعموم پچھلے پہر علی الصبح شکار کو جانے والے شوقینوں کا انداز ہوتا ہے، بلکہ یک گونہ کراہیت اور سستی سی محسوس ہو رہی تھی، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں آج شکار کو نہیں گوشت کے لئے جا رہا تھا۔ جلدی کپڑے پہنے جیبوں میں کارتوس بھرے۔ شکاری خاں نے ایک کاندھے پر رائفل ٹانگی دوسرے پر تھیلا، پانی کی بوتل لٹکائی، میں آگے آگے وہ پیچھے پیچھے چپ چاپ کیمپ سے نکل کر چل دیئے، سمت کا تعین جیسے دل ہی دل میں ہو گیا اس سلسلہ میں بھی بات کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ تقریباً دو فرلانگ بڑھنے کے بعد میرا موڈ اپنی جگہ پر آ گیا اور میں اپنی اصل پر پلٹ آیا اندر والا شکاری تن گیا اور جب شکاری نے ایک گہری نگاہ پھینکی تو اس کو پیچھے ہٹا کر اور بھی اندر سے مناظر فطرت کا شیدائی آگے آ گیا۔ میں وقت کی کیفیت اور ماحول کی اداس اداس نیرنگی میں کھو کر رہ گیا۔ زوال ماہ کا دوسرا ہفتہ شروع ہوا تھا، آخیر تاریخوں کا کٹا ہوا کمزور کمزور بیمار بیمار خائف سا چاند میرے عین سامنے پہاڑی کی چوٹی سے اُچک رہا تھا۔ زرد زرد بے روح سی چاندنی میں سنسان ماحول جیسے ابھرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں خارجی و داخلی ہر پہلو سے چاق و چوبند تھا، دھندلے ماحول کے

نشیب و فراز، چاندنی کی علیل روح، اور جنگل کا مہیب سناٹا سب مل کر مجھ کو دبانا چاہتے تھے اور ایک قنوطی احساس کی جانب لے جانا چاہتے تھے، مگر موسم بہار کی کیف آگیں مستانہ وار چال چلتی ہوئی نسیم سحری شراب دو آتشہ بنی ہوئی سب پر حاوی تھی اور جیسے میری سانس کے ساتھ شکر کی صورت میں نفوذ کر کے رونگٹے رونگٹے پر ہلکا سرور طاری کر رہی تھی، شکار کے قاعدہ کے بموجب میں گنگنا تو نہ سکتا تھا مگر جیسے میرے اندر آہستہ آہستہ ساز بج رہا تھا اور جمالِ فطرت کے اس انوکھے نظارہ میں جس میں سب کچھ نظر آنے کے باوجود کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا اور جو کچھ دکھائی دے رہا تھا حسن ہی حسن معلوم ہو رہا تھا مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ٹھیک نسیمِ سحری میرے جسم کو آہستہ آہستہ اس غمناک ماحول میں حل کر رہی ہے۔ جیسے میرا وجود اس پھیکی پھیکی خنک نمناک چاندنی سے ہی تشکیل پائے ہوئے ہے اور میں پھر اسی میں ملا جا رہا ہوں۔ والہانہ انداز میں بڑھتا ہوا اس پہاڑی کے اس ڈھال سے چڑھ کر اس ڈھال سے اترا درمیان کی وادی طے کر کے اس چوٹی پر پہنچ گیا۔ جہاں پہلے چاند ابھرتا نظر آیا تھا اور اب چاند دور بہت دور گھنے جنگل کے بلند و بالا درختوں کی پھنگیوں پر لٹکا دکھائی دیا۔ اور اس پہاڑی کے ڈھال سے اتر کر اور دوسری سطح وادی طے کرتا سامنے والی ایک اور پہاڑی کی جانب بڑھا جو نسبتاً کم بلند تھی اور جس کے ڈھال چاروں طرف دور تک پھیلے ہوئے تھے اور پہاڑی سے زیادہ ٹیلے سے مشابہ تھی اس پر جھاڑیاں گھاس اور درخت بھی کچھ مسطح وادی جیسے اور کچھ اونچی پہاڑیوں پر اُگنے والی قسم کے ملے جلے تھے اور نسبتاً زیادہ گھنے تھے اور اس کی نوک یہ چوٹی جیسی ڈھلوان نہ تھی بلکہ مسطح قطعہ کی شکل میں تھی اور جب میں نے اس کا ڈھال طے کیا تو اندازہ کیا کہ یہ اوپر سے ہلکے اتار کی شکل میں سامنے والی وادی سے مل گیا ہے جیسے اونچائی اور نیچائی نے نہایت مناسب انداز میں سمجھوتہ کر کے اپنا سلسلہ ملا لیا ہے اور اب سامنے وادی لق و دق میدان کی شکل میں تھی، اس میں ایک جانب بڑا مہیب سال سہل اور ٹیک کا جنگل تھا جس میں گھاس سے لیکر فلک بوس درختوں کی چوٹیوں تک درمیانی جھاڑیوں اور پیچ در پیچ بیلوں نے ایسا بے پناہ سلسلہ ملایا تھا کہ اس کے اندر ان پگڈنڈیوں کے علاوہ جو مختلف النوع جنگلی جانوروں کی گذر گاہیں تھیں دو قدم بھی اِدھر اُدھر پھرنا ناممکن تھا اور اس میدان میں اسی جنگل کا سلسلہ دو جانب سے رفتہ رفتہ کم گھنا ہو کر چھدرا ہوتا چلا گیا تھا، اس میں بلند درخت ذرا دور دور تھے، بڑی جھاڑیاں جگہ جگہ تھیں مگر مسلسل اچھی قسم کی گھاس بڑی گھنی اور زوردار تھی اور یہ جنگل کم اور میدان زیادہ قسم کی جگہ جنگلی چرندوں کی چراگاہ تھی جو ہزاروں مربع میل پر مشتمل ہوگی، اس کے دو کناروں پر لگا ہوا گھنا جنگل جانوروں کی پناہ گاہ تھی اور یہ وقت تقریباً چھوٹے بڑے ہر جانور کے اس چراگاہ کے میدان پر ہونے کا تھا۔ ڈھلان کے حصہ پر آخری قدم ڈال رہا تھا کہ میں نے یکدم محسوس کیا کہ بیمار اور کمزور چاندنی پر موت کی زردی جھلنے لگی۔

صبح کاذب کے آثار نمودار ہونے اور ایک جماہی سی لیکر اوپر نگاہ اٹھائی تو تاروں بھرے آسمان پر ایک خطِ نور مشرق سے مغرب تک کھنچا دکھائی دیا، پیچھے پلٹ کر دیکھا تو سُوکھ بڑے زور سے ٹمٹما ٹمٹما کر جیسے کار بائٹ کی شعاعیں سی چٹخانے کی کوشش کر رہا تھا اور سامنے نظر اٹھی تو مغربی افق پر مشرق کی انعکاس سے نور پاشی شروع ہو رہی تھی، اور بمشکل دو ڈھائی سو قدم بڑھ پایا ہوں گا کہ جیسے بھک سے ہو گیا۔ مرتے چاند اور ابھرتے سورج کی آویزش میں چپکے سے سمجھوتہ ہو گیا اور چاندنی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ سپیدۂ صبح کا رُوپ دھار لیا۔ تارے دھندلی دھندلی نیلی ردا میں چھپ گئے اوپر سے نیچے تک دائیں بائیں آگے پیچھے نورِ سحر کی لہروں کا تابناک و نمناک سلسلہ مل گیا۔ مرغیاں کُڑکُڑائیں اور مرغوں نے جنگل کے اندر شاخ شاخ پتہ پتہ کا رشتہ اپنی بانگوں سے جوڑ دیا، موروں نے ارغنوں بجائے اور مست تیتروں نے پٹیل پٹیل کر نیچے سے اوپر تک تمام جنگل سر پر اٹھا لیا، کہیں کہیں دور کوئی چیتل اور سانبھر دھانسا اور جگہ جگہ کا نگر ٹھونکا اور میرے کان ان آوازوں پر چونکے، جمالِ فطرت کا شیدائی اندر دبک گیا اور شکاری بڑھ کر آگے آ گیا اکڑ فوں، ترچھی گردن، تند گام اور نظر کی کمندیں تیز تیز اچھلنے لگیں، پلٹ کر شکاری خاں کے ہاتھ سے رائفل لے لیا اور جیسے میری چھٹی حس بروئے کار آگئی، اور جس وقت یہ شدید ہوتی ہے تو الہام سا ہوتا ہے اور یکدم کچھ نہ کچھ شکار سامنے آجاتا ہے اور میں بڑی دقتِ نظر کے ساتھ چھدرے جنگل نما گھاس کے

میدان کا جائزہ لیتا اور قدم قدم پر کوئی شکار سامنے آنے کے خیال میں کھویا بڑھ رہا تھا کہ یکدم شکاری خاں نے میرا ہاتھ چھو کر میری توجہ کچھ کھوجوں کی جانب زمین پر مبذول کی اور دفعۃً شوق سے میرا دل سرشار ہو گیا۔ ہیل کے ایک گلہ کی خبر اپنے جنگل میں مدتوں سے سن رہا تھا اور یہ اسی کے کھوج تھے، اور میں نے جنگل تو جنگل کبھی چڑیا گھر میں بھی نہ دیکھا تھا دراصل یہ ہمارے جنگلوں میں پایا ہی نہیں جاتا ہے ویسے جس وقت پھڑک کر دوڑ پڑتا ہے تو اس کا چھوٹے سے چھوٹا دھاوا پچیس تیس میل کا ہوا کرتا ہے، شروع سیزن میں اس کے ایک گلے کی آمد کی خبر سنی تو یقین نہ آیا کیونکہ وہ جنگلات جہاں یہ پایا جاتا ہے بندھیاچل کی ترائی کے ہیں یا زیادہ سے زیادہ قریب ہیں تو تین چار سو میل وسط ہند کے، اور ادھر فاریسٹ میں ان کا وجود بالکل عجوبہ چیز تھا۔ مگر موجود تھے اور میرے سامنے ان کے کھوج تھے اور کھوج بھی بالکل تازہ یہی ابھی گھنٹہ بھر کے اندر کے، ساتھ ہی ساتھ کھوجوں کے نشانات کا اندازہ ایسا تھا کہ بالکل شانت تھے اور مزے مزے چرتے ہوئے، کبھی پگڈنڈی پگڈنڈی کبھی اِدھر اُدھر گھاس میں گھومتے ہوئے آہستہ آہستہ چرتے بڑھتے تھے اور میں نے کھوجوں سے بھی اندازہ لگا لیا کہ بس زیادہ دور نہیں گئے ہیں۔ میرا ان کے شکار کے متعلق ذاتی تجربہ تو تھا نہیں ایسے ہی شکاریوں کی زبانی سنا تھا اور ان کی جبلت کے متعلق ان شکاریوں میں سے بھی اکثر کا علم کتابوں کا تھا ایک دو ایسے شکاریوں سے بھی ان کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی جنہوں نے خود تو مارا نہیں تھا مگر جس پارٹی میں یہ شریک تھے ان میں ساتھیوں نے شکار کیا تھا اور ان کے شکار کے متعلق میرا جو تجربہ تھا وہ ظاہر ہے۔ اور کھوجوں پر بڑھنے سے پیشتر ہی مجھے یکدم دھچکا سا لگا اور میں ہاتھوں ہی ہاتھوں میں آہستہ آہستہ اپنی رائفل کو کروٹیں سی دے دے کر دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔ یہ ۳۲۔ اسپرنگ فیلڈ تھا۔ ہائی ولاسٹی، ہلکی اور تیز رفتار گولی والا ہتھیار، پتلی کھال کے جانوروں کے شکار کے لئے موزوں ہے، زیادہ فاصلہ پر صحیح اور مہلک چوٹ پہنچانے کے لئے بالکل مناسب، قصہ مختصر، باڑھے سے لیکر سانبھر تک درندوں میں بھیڑیئے سے لگا تیندوے تک بہت کافی ہے۔ اور اس کا بنانے والا تو شیر کے لئے بھی اس کو بالکل ٹھیک بتاتا ہے اور تجربات بھی کہتے تھے کہ ٹھیک ہی ہے مگر شیر کے شکاری عام طور پر اس کو استعمال نہیں کرتے بلکہ اس سے اور زیادہ موزوں بور پسند کرتے ہیں، لیکن اس شکار کے لئے جس سے میں اس وقت دوچار تھا نہ تو اس کا بنانے والا ہی اس کو استعمال کرنے کے لئے کہتا ہے اور نہ شکاریوں کا ہی کوئی گروہ اس کے متعلق اپنا تجربہ بتا کر موزوں بتاتا ہے، اس شکار کے لئے تو چند مخصوص وزنی گولی والے اور شدید صدمہ پہنچانے والے کارڈائٹ بارود کے رائفل ہیں اور مجھے اپنا دونالہ ۴۰۰/۴۵۰ کارڈائٹ یاد آیا جو یہاں سے کم و بیش دس میل کے فاصلے پر کیمپ میں میری چارپائی کے نیچے بکس کے اندر رکھا ہوا تھا۔ اور یہ بڑا اہم مسئلہ تھا، ایک معمولی بات کمزور ہتھیار کے استعمال کی یہ ہے کہ شکار چٹیل ہو کر بھاگ جاتا ہے ہمارے ہاتھ بھی آتا نہیں اور ایک مدت تک سخت اذیت میں مبتلا رہ کر گھل گھل کر مرتا ہے جو اسپورٹس مین کے مسلک میں بڑی مذموم چیز ہے اور یہاں پر اس کو جلد از جلد ختم کرنا اس کی ذمہ داری بن جاتی ہے جس سے روبراہ ہونا ناممکن ہوتا ہے اور پھر مجھے یہ بھی یاد آیا کہ۔ کبھی کبھی چٹیل ہو کر انتقام کی آگ میں حملہ بھی کر دیتا ہے اور اس کی جبلت پرلے درجہ کی منتقم ہے۔ یہاں تک کہ اگر شکاری کسی ایسی جگہ پر پناہ لے لے جو اس کی رسائی سے باہر ہو مچان یا درخت وغیرہ تو یہ انتقام کے جنون میں اس کے اردگرد منڈلاتا رہتا ہے اور ہٹتا نہیں خواہ وہیں پر سوکھ سوکھ کر مر جائے انتقام کی آگ نہیں بجھتی اور اس کے متعلق بعض دکن اور سی پی کے شکاریوں کے سنائے ہوئے دو ایک قصے بھی ذہن میں ابھرے جنہیں سنتے وقت میں نے کہانی اور شکاری گپ سے آگے نہ سمجھا تھا۔ اور جیسے مجھے کسی نے پیچھے کھینچا، رائفل کا وزن بہت ہلکا محسوس ہوا گویا ہمارا ہاتھ خالی ہے۔ مگر سینے کے اندر شوق کی لہر جو اٹھی تو اس کی رو میں ہم دونوں نے کھوجوں پر بڑھنا شروع کر دیا میں نے اس رائفل کے سب سے بھاری ۲۵۰ گرین والی ٹھوس گولی کے کارتوسوں کی ڈبیہ جیب سے نکالی، میگزین میں سے ہلکی اور پھٹنے والی گولی کے کارتوس علیحدہ کئے اور انہیں بھر کر میگزین فٹ کیا۔ اس ۲۵۰ گرین والی ٹھوس گولی کا جو لٹریچر کارخانہ والوں نے بھیجا تھا اس میں بھی انہوں نے یہ تو نہ لکھا تھا

کہ یہیں کے شکار کے لئے ٹھیک رہے گی البتہ یہ ضرور لکھا تھا کہ یہ گولی میگنم کارڈائٹ رائفلوں کی گولی کا ایک حد تک کام دے سکتی ہے۔ اور اچھی چوٹ پر جائے تو بعض موٹی کھال والے بڑے جانوروں پر بھی موثر ہو سکتی ہے، اور مجھے جیسے یکدم اپنے اس سبک ۳۰۔ اسپرنگ فیلڈ میں ہی اپنے دونالے ۵۰۰/۴۵۰ کا وزن محسوس ہونے لگا۔ اونہہ، سب بیکار واہمہ، اور شکاری کو مفروضہ خطروں سے ڈرنے کے معنی یہ ہیں کہ شکار چھوڑ دے اور ہم دونوں بڑے شوق وانہماک میں سب کچھ پس پشت ڈالے بڑھتے جا رہے تھے۔ کھوج بہت واضح تھے اور زمین نم تھی۔ مگر زمین تک نگاہ ڈالنے کی نوبت نہ آئی تھی، گھاس شبنم آلود تھی اور دور تک ان کا راستہ علیحدہ شاہراہ کی طرح دکھائی دے رہا تھا اور چند قدم ڈالنے کے بعد ہماری نظریں دور کا جائزہ لیتی چلتی تھیں اور قیاس کے ساتھ گلہ کی موجودگی کی سمت کا تعین کر رہی تھیں۔

اور تھوڑی دیر چلنے کے بعد دور گھنے درختوں کی کالی کالی پھننگیوں پر مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کی زر پاشی ہوگئی اور دیکھتے دیکھتے ہری ہری گھاس کے لق و دق میدان پر سونا بکھر گیا شبنم کا ایک ایک موتی دمک اٹھا، بڑھتے بڑھتے کھوج ہم کو گھنے جنگل کی سمت لے گئے اور جب ہم کنارے پر پہنچے تو یک گونہ تعجب ہوا پورا گلہ علی الصبح گھنے جنگل میں گھسا تھا میں نے شکاری خاں کی طرف دیکھا جو جنگل کے ہر چرندے کی جبلت کا محرم تھا اور یہ وہ بھی جانتا تھا اور میں بھی کہ چرندے کی جس قسم کا ہم اس وقت پیچھا کر رہے ہیں یہ دنیا کے ہر چوپائے سے زیادہ ذکی الحس اور آدمی سے بھاگنے والی جبلت کا حامل ہے۔ اس کا شامہ بلا کا تیز ہے اگر ہوا کا رخ اس کی جانب ہو تو میلوں سے آدمی کی بو لے کر توک دم بھاگتا ہے اسکی سماعت کا یہ عالم ہے کہ شیر کے کان اس کے کانوں کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں ہیں، میل بھر کے فاصلہ پر اگر آدمی اک ذرا کھانس دے تو یہ سنکر فرار ہو جاتا ہے اور ایک دوڑ پچیس تیس میل بھاگ کر سانس لیتا ہے اور اتنی دور بھاگ کر بھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں خطرہ کے احساس سے مستغنی ہو پاتا ہے۔ جنگل میں UN-CHALLANGED زندگی بسر کرتا ہے، اور تو کوئی اس کا مدمقابل ہے نہیں تجربہ کار شیر ان سے کترا کر نکل جاتا ہے۔ کبھی کوئی نوجوان شیر حملہ کر بیٹھتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ گلہ میں سے ایک جانور تو ضرور کام آجاتا ہے مگر اس شیر کی کھال کی دھجیاں ان کے سینگوں ہی میں لپٹی دکھائی دیتی ہیں۔ اور گوشت کی بوٹیوں کا تو پتہ ہی نہیں چلتا، جیسے چکی کے پاٹوں میں پیس دیا، دنیا میں اس کا کوئی حریف ہے تو آدمی، اور آدمی کا سایہ تو بہت دور کی چیز ہے بُو سے یہ چھلاوہ ہو جاتا ہے، مشہور بات ہے کہ ایک مرتبہ کا ڈر کر بھاگا ہوا گلہ اس دن پھر شکاری کو نظر نہیں آسکتا۔

میرے اور شکاری خاں کے درمیان اشاروں ہی اشاروں میں بات ہوئی اور ہم نے قیاس کر لیا کہ گلہ جنگل کا یہ کونہ پار کر کے ادھر نکل گیا لہذا بجائے اس کے کہ جنگل کے اندر گھس کر کھوج لیں کنارے کنارے چل کر ادھر پہنچ جائیں اور پھر کھوج اٹھالیں اور جب ہم جنگل اور گھاس کے میدان کے ملے ہوئے خط پر ایک جانب سے چل کر جوں ہی گوشہ پر پہنچے اور دوسرے خط پر چلنے کا ارادہ کیا تو سامنے گھاس کے میدان پر پورا گلہ کھڑا نظر آیا جگہ جگہ چھوٹے بڑے درخت تھے اور کہیں کہیں بانس کی جھاڑیاں تھیں اور شاداب اونچی گھاس تھی۔ اور ہم فوراً دبک گئے۔ اور سب سے پہلے میں نے ہوا کی سمت کا تعین کیا تو اطمینان ہوا۔ یہاں پر بہت ہی موافق تھی اور بالکل ان کے اوپر ہو کر ہماری جانب کو چل رہی تھی۔ اب گھنے جنگل کے کنارے کی جھاڑیوں میں چھپ کر میں نے بڑا مکمل جائزہ لیا، ہر جانور کو پرتا لا، گنا، ہر ایک کے رُخ اور چلنے کے رجحان کا اندازہ لگایا۔ نر اور مادہ دیکھے، سب سے بڑے گلہ کے سردار کو بھانپا۔ اپنے اور ان کے درمیان فاصلہ کا اندازہ کیا، اور اگرچہ وہ چل پھر رہے تھے۔ اور جیسا کہ چرتے وقت ہوتا ہے کسی کا کوئی مقام معین نہ تھا۔ مگر وہاں پر گھاس بالکل نئی اور شاداب تھی لہذا بڑے انہماک کے ساتھ چر رہے تھے۔ میں نے بڑے اطمینان کے ساتھ ایک ایک کو پرتالا، گلہ میں پانچ سانڈ اور چالیس مادائیں او بچے تھے اور اب میں نے پانچوں سانڈوں پر نظر ڈالی، چار نوجوان تھے اور پانچواں، بڑا شاندار، بھاری سینگوں اور پہاڑ سے تن و توش کا حامل تھا اور رنگ ڈھنگ شان و شوکت ہر اعتبار سے اس گلہ کا سردار دکھائی پڑتا تھا۔ اور ان چاروں کا باپ یا دادا ہوگا۔ اور بس اسی پر میری نگاہ جمی؛ جبلت کے

مطابق، پانچوں سانڈ دو تین منٹ بعد گھاس میں سے سر اٹھا کر وحشی نظروں سے ماحول کا جائزہ لیتے تھے اور پھر چرنے لگتے تھے۔ بچے اور مادائیں مستقل طور پر گھاس کے اندر منہ دیئے ہوئے تھیں البتہ ایک بڑی بوڑھی جو ڈیل ڈول اور عمر کے لحاظ سے سردارنی معلوم ہوتی تھی تھوڑے تھوڑے وقفہ سے سر اٹھا کر دیکھتی مگر ایسا اندازہ ہوتا کہ وحشت میں نہیں، گھاس کے قطعہ کا جائزہ لیتی ہے کہ اچھا کھانا کدھر کدھر ہے۔ اور میں نے گہرا جائزہ لیا تو اندازہ کیا کہ کسی کسی وقت دو دو تین تین منٹ کا وقفہ ایسا گزرتا ہے کہ ہر جانور کی آنکھیں ڈیڑھ گز اندر گھاس میں بند ہوتیں ہیں۔ اب میں نے ایک مخصوص مقام کا تعین کیا جہاں سے سردار اچھے رینج میں تھا اور یہ ایک چھوٹے بانس کی جھاڑی تھی اور اس تک آڑ ہی آڑ پہنچنے کا ایک راستہ نظری پیمائش سے متعین کیا، مگر جنگل چھدرا تھا اور اس جگہ تک مکمل آڑ نہ تھی لہٰذا میں نے ایک جھاڑی، پھر دوسرا درخت، پھر تیسری جھاڑی پھر چوتھی بانسی، اور پھر اس بانس کی جھاڑی تک اپنے راستہ کا نقشہ ذہن میں قائم کیا اور یہ راستہ مجھے کھلے ڈھکے تقریباً ڈھائی تین سو گز طے کرنا تھا۔ اور سب کا سب ان ساعتوں میں جس وقت پورے گلے کی آنکھیں گھاس کے اندر ہوں۔ ہوا بہت سازگار و موافق چل رہی تھی یعنی گھاس میں ہلکی ہلکی آواز بھی پیدا کر رہی تھی اور ان کی جانب سے میری جانب آ رہی تھی نہ بو پہنچنے کا امکان تھا نہ کھٹکا ہی۔ میں نے بسم اللہ کر کے اور پھر پورا جائزہ لے کر پہلی منزل کی جانب قدم اٹھایا اور بے کھٹکے جھاڑی کی آڑ پکڑ لی۔ دو تین منٹ پھر جائزہ لیا اور ایسی ہی مبارک ساعت میں دوسری منزل پکڑ لی، اور پھر فرداً فرداً ہر جانور کو پرتالا، اور میری تیسری منزل بڑی لمبی چوڑی آڑ تھی، سال بھر پہلے ایک بلند و بالا سال کا درخت آندھی میں گر کر جا پڑا تھا تقریباً چہارم ایکڑ زمین پر موٹے موٹے گدّے اور درمیانی موٹائی کی شاخیں چاروں طرف پھیلی ہوئیں تھیں کچھ بالکل خشک کچھ باوجود ٹوٹ جانے کے بھی نیم خشک نیم سبز بعض بالکل زمین پر پڑی ہوئیں تھیں بعض جھک گئی تھیں اور بے ترتیبی کے ساتھ مختلف رُخ اختیار کر گئی تھیں کچھ ایسی تھیں کہ اوپر موٹے تنے سے جڑی رہ گئی تھیں اور چیر کر اُفق کے رُخ کو سیدھی سی ہو گئی تھیں یہ زمین سے آٹھ فٹ بلند تھیں، میں نے اس کی آڑ میں کھڑے ہو کر اچھی طرح اور اطمینان کے ساتھ جائزہ لیا، اور یہاں سے منزل مقصود تک درمیان میں ایک ہالٹ اور تھا اور بس پھر وہاں سے سردار بمشکل پندرہ گز کے اردگرد رینج میں ہوتا تھا۔ خوب سُستا کر میں بڑھا، مگر چند قدم ڈالنے کے بعد اسی درخت کے سوکھے اور کرخت پتوں کے ڈھیر سے دوچار ہوا۔ گھاس میں چھپنے کو اچھی جگہ دکھائی نہ دی مجبوراً ایک جانب کو ہٹنا ہی پڑا مگر جہاں پر تیزی کے ساتھ ہٹنے کے بعد پاؤں پڑا وہاں پر بھی گھاس کے نیچے ایک چھوٹی ڈھیری انہیں پتوں کی پڑی تھی، جوتا اگرچہ ربڑ سول کا تھا پھر بھی سوکھے پتوں پر یک لخت چٹاخا ہو ہی گیا میں نے لپک کر جھاڑی تو لے لی مگر پتوں کے چٹاخے پر تقریباً ہر ایک نے گردنیں اٹھالی تھیں اور ہر کوئی بھاگنے ہی والا تھا خطرہ کا احساس پورا ہو چکا تھا بس کسی ایک کے قدم اٹھانے کی دیر تھی اور مانو سب کے سب پلک مارتے اُدھل۔ سردار بہت اچھے نہیں تو بُرے رینج میں بھی نہ تھا، وہ منزل مقصود والی بات تو نہ تھی تاہم زاویہ اچھا تھا تقریباً پورا بدن گھاس کے اندر تھا۔ شاندار گردن اور پرشکوہ سر گھاس کی پھننگیوں سے گز بھر اونچا اٹھا ہوا تھا، پچاس ساٹھ گز کا فاصلہ تھا، میں نے گردن پر شست لے کر دن سے فیر کر دیا۔ اور فیر کے بعد اپنی نگاہ اور شعور اتنا بھی درست نہ کرنے پایا تھا کہ یہ اندازہ کروں کہ کیا نتیجہ ہوا کہ یک دم میرے بائیں جانب سے میرے اوپر موت جھپٹی، ایک نوجوان سانڈ توپ کے گولے کی طرح مجھے اپنے اوپر جھپٹتا نظر آیا اور جب تک میں نے رائفل تیار کر کے اٹھایا وہ مجھ سے پندرہ گز کے اندر تھا، میں نے چابک دستی کے ساتھ اس کے جھکے ہوئے سر سے بالشت بھر پیچھے اس کی گردن کے اوپری رُخ پر شست لے کر گولی ماری یہ بہترین پوائنٹ تھا، اور فیر کے دھماکے کے ساتھ گولی لگنے کا مخصوص چٹاخہ بھی میرے کان میں گیا۔ مگر اس کی رفتار کی تندی میں کوئی فرق نہ آیا البتہ جیسے ایک دھکے نے اس کا رُخ میری سیدھ سے ایک ذرا ہٹا دیا اور جب وہ بگولے کی طرح میرے محاذ میں پہنچا تو مجھ سے ترچھا ترچھا کٹا ہوا سا پچیس گز کے فاصلے پر تھا اور میں اس شدید حادثہ کی اہمیت کا ابھی پورا اندازہ بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اس نے ایک بھیانک آواز نکالی اٹرا اڈوں، ڈھاڈوں، ڈھاڈوں، اور سیدھا ہو کر جیسے ڈاک گاڑی کا انجن میرے اوپر چلا۔ میں نے اچھی طرح شست لے کر پھر گولی لگائی، یکدم بریک سا لگا جیسے انجن پٹڑی سے اترتے اترتے سنبھل گیا اور پھر

اسی تندی کے ساتھ بڑھا مگر بریک کے جھٹکے میں حملہ کے رُخ کا توزن صحیح نہ رہ سکا اور نہ یہ بارہ من وزن کے طاقت بھری اور تندی کے مجسمہ کے لئے ایسی
صورت میں ممکن تھا اور اب کی مرتبہ جو توازن بگڑا تو بجائے میرے، اور پہنچنے کے مجھ سے چالیس پچاس گز ایک جانب جاکر سنبھل سکا اور پھر بڑے زور سے
ڈکرایا، ڈیک ڈیک، ڈمک، ڈیہیہ، ڈیہیہ، ڈھی، ڈھی، ڈھاڈوں؛ اور پہلا حملہ تو دراصل حملہ تھا ہی نہیں بلکہ اس کا سر گھاس میں تھا اور اتفاق سے رُخ
میری جانب، فیر کی آواز میں وحشت میں جدھر کو منہ تھا بھاگ پڑا اور میں نے حملہ سمجھ کر گولی مار دی اور گولی کھا کر تو پھر وہ انتقام میں تابڑ توڑ حملے کرنے لگا،
اور یہ حملہ پہلی جھپٹ اور دوسرے حملہ دونوں سے زیادہ تند تھا، جیسے شدید انتقام کی آگ میں کُل کا کُل تو وہ بارود کی طرح بھڑک کر قہر و غضب کے
طوفان کی صورت مجھ پر جھپٹ پڑا اور جتنی دیر میں وہ سنبھل کر جھپٹا مجھ کو ایک لمحۂ فکر میسر آیا، اپنے ہتھیار کی کمزوری اور اپنے غیر محفوظ ہونے کا پورا
احساس ہو گیا اور میں نے یہ جگہ چھوڑ کر ایک موٹے درخت کے تنے کی آڑ پکڑ لی اور یہاں سے معقول زاویہ پر تیسری گولی لگائی جس کا چٹاخہ دھماکے
کے ساتھ نمایاں سنائی دیا، بجلا کر پہلے جیسے گولی کی ٹکر سے چند گز ٹھوکریں سی کھائیں اور اب کی مرتبہ گولی اور اس کی رفتار کے تصادم میں بڑا اچھا بریک
لگا اور جب وہ سیدھا ہوا تو میرے رُخ سے ہٹ کر کہیں سے کہیں جا پڑا تھا اور مجھ سے بائیں جانب سو سوا سو گز کے فاصلہ پر سنبھل کر، دھاں
انک، دھاں انک، ڈھی، ڈھی، ڈھیک ڈھیک، بڑے زور سے نئے حملے کے لئے تیاری کر رہا تھا، اور اگلے کھروں سے زمین کھود کر اڑاڑا دوں،
دھوں، اب کی مرتبہ اتنا شدید حملہ کیا کہ اگر میں اس درخت کی آڑ نہ پکڑ چکا ہوتا تو اوسان کھو دیتا، اور تیسری گولی کھانے کے بعد ایسا تند و تیز حملہ
میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ رائفل میں آخری کارتوس باقی تھا اور مجھ کو اپنے ہتھیار کی کمزوری کا پورا پورا احساس ہو چکا تھا مگر اوسان برقرار
تھے میں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس درخت کے تنے کی آڑ پکڑی جس میں اردگرد کی گھاس معاون ہوئی اور خرگوش کی طرح دبک گیا اور مجھ کو
اس طرح غائب ہوتے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا اور کچھ فاصلے پر کھڑا ہو کر یہ اندازہ لگانے لگا کہ میرا دشمن کہاں ہے اور تقریباً دو منٹ تک اس جھاڑی کی سمت جس میں پہلے
تھا اور اس تنے کی جانب خونبار آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ ادھر مجھکو یک گونہ اطمینان کے ساتھ سوچنے کا موقع ملا، میں نے اندازہ لگایا کہ رائفل اس کیلئے بہت ناکافی
ثابت ہوا، اور تین گولیاں اسکے جسم پر ایسی رائگاں گئیں جیسے سنگِ خارا کی چٹان پر، اسمیں شک نہیں کہ انہوں نے اک ذرا حملہ کا رُخ پھیر کر موت سے بچا دیا، یہ چوتھی اور یہی
پھر پھر یہ مجھکو زندہ نہ چھوڑیگا اور یہیں پہ روند دیگا اور بچنے کی شکل؟ بچنے کی شکل صرف کسی درخت پر چڑھکر پناہ لینا ہے۔ اور یہ درخت جسکے تنے کی آڑ میں اسوقت بیٹھا
ہوں یہ تو بہت ہی بے ڈھب ہے اور ایسے نازک وقت میں اس پر چڑھنے کا خیال بھی نہ لانا چاہیئے۔ اور میں نے بغیر گردن گھمائے کنکھیوں سے اردگرد کے اور درختوں کو دیکھا،
وہ سب کے سب ایسے ہی بے ڈھب تھے اور کسی پر بھی چڑھنے کی کوشش کرنا موت کو دعوت دینا تھا۔ بس وہ ٹوٹا ہوا درخت مناسب تھا، مگر وہاں تک پہنچنا تیس چالیس گز کا فاصلہ
اسوقت ہفت خواں طے کرنا تھا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے تو یہ مجھکو تیس چالیس مرتبہ پیس ڈالے گا اور ایک صورت ذہن میں آئی، میں نے اندازہ کیا کہ اسوقت یہ مجھ سے پندرہ بیس گز ——
کے فاصلہ پر ہے اور ادھر مجھ کو ٹوٹے درخت تک پہنچنے کے لئے تیس چالیس گز طے کرنا ہیں اگر میں اس کو اس جگہ سے جہاں پر کہ یہ اس وقت کھڑا
ہے سو سوا سو گز اُدھر آگے کو ہنکا دوں تو اِدھر تیس چالیس گز کا فاصلہ دوڑ کر خیریت کے ساتھ طے کر سکتا ہوں اور چوتھی گولی اس کو مارنے
کے لئے نہیں ایک مخصوص سمت کو ہنکانے کے لئے تو کافی تھی، صورت میرے ذہن میں تھی اور ایک مرتبہ جب اس نے حرکت کی اور میری جانب
کو ایک ذرا پچھاڑی سی ہوئی میں نے بغیر کوئی خاص پوائنٹ شست میں لئے پسلیوں پر ترچھے ترچھے تنگ زاویے پر گولی لگائی، ظاہر بات ہے کہ
گولی کی سمت کا صحیح تعین کر لینے کے باوجود بھی وہ اپنے بھاری جسم کو یکدم موڑ نہ سکتا تھا، پہلے تو تیس چالیس گز اُدھر ہی کو ریلا دیتا ہوا نکل چلا گیا۔
جدھر کو منہ کئے ہوئے تھا۔ اور پھر کچھ چوکڑی سی بھول کر دیوانہ وار اِدھر اُدھر رش کرتا رہا، اور جب تک جسم اور دماغ کو مربوط کرکے وہ میری جانب
پلٹا میں ٹوٹے ہوئے درخت کی سمت تقریباً دس بارہ گز ہی طے کر سکا تھا کیونکہ راستہ صاف نہ تھا، سوکھی ہوئی چکنی پتیوں پر پاؤں بھی پھسل رہا
تھا، جھاڑیاں بھی دامن پکڑتی تھیں، گھاس اور گھاس پر لپٹی ہوئی باریک باریک بیلیں بھی روکتی تھیں اور میں اس کی نظر سے بچنے کی بھی کوشش کرتا
چل رہا تھا۔ اور چل کیا رہا تھا، سرک رہا تھا، پھسل رہا تھا، پھدک رہا تھا۔ اور گردن اور کمر جھکائے کہیں کہیں پر دو چار ڈگیں بھر لیتا تھا ساتھ ہی ساتھ

یہ بھی اندازہ کر رہا تھا کہ یہ وحشت اور چوٹ میں دیوانہ وار اچھل کود رہا ہے لیکن ہنوز میری سمت کا پوری طرح تعین نہیں کر پایا ہے اور بیتاب ہو ہو کر ایسی سمتوں کو جھپٹا ہے جو میری سیدھ سے ہٹی ہوئی ہیں۔ اور جیسے کچھ شکست خوردگی اور ضرب کے سبب غصہ میں ارش ہی ارش کر رہا ہے۔ اور حملوں میں توازن نہیں ہے۔ اور تیس چالیس گز واقعی مجھ کو ہفت خواں بن گئے۔ راستے نے مجھے بہت ہی الجھایا اور شاید ایسے وقت میں سیدھے سے سیدھا راستہ بھی ساونٹ کی چوہی نیوے نیوے اکھلا اپنا چھ فٹ ایک انچ لمبا قد کہاں تک چھپاتا، جھلک نظر آ ہی گئی، اب حملہ میں وہ اندھا دھندپن نہ رہا بلکہ ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہوا۔ حملہ اور حملہ ہی حملہ کر کے ریزہ ریزہ کر دینے والا وحشیانہ انداز جبلت سے زائل ہو گیا اور سمجھ کر رخ بدلا۔ اور درخت مجھ سے چند لمبی ڈگوں پر تھا۔ اب خوش نصیبی سے یہاں پر راستہ بھی ذرا صاف اور ہموار تھا۔ میں بڑا تیز دوڑا اور اس نے پاگل کتے کی طرح میرا پیچھا کیا۔ اور نہ معلوم کتنی تیز رفتار تھی درخت کے نیچے تک پہنچتے پہنچتے بالکل میری پشت پر آ گیا۔ ڈھوں، ڈھائیں، ڈھاں، ڈھی۔ ایک خوں آشام ڈینک میرے کانوں نے سنی اور مجھے اپنی پیٹھ میں ایک چمک سی محسوس ہوتی اور پھر ایسا معلوم ہوا کہ ریڑھ کی ہڈی کے اندر اوپر سے نیچے تک برف کی سلاخ سی اترتی چلی گئی۔ جھکی ہوئی موٹی شاخ پکڑنے کے لئے لنگور کی طرح اچھلا دونوں ہاتھ اوپر بڑھے، اور شاخ ہاتھوں میں بھر کر لٹکتی موٹی ٹانگوں کو جھولا دیا اور دوسری جانب سے پاؤں کی گرفت میں لینے کے لئے اچھالا تو اس کی گرم گرم سانس میری پنڈلیوں پر مس ہوئی اور جوتے کی تو سینگوں کی نوکوں کو چھوتی ہوئی اوپر آئی، اور جب اس عالم رستخیز میں مجھے اپنی خبر ہوئی تو دونوں ہاتھوں اور دونوں ٹانگوں کی گرفت میں لئے ہوئے چھپکلی کی طرح موٹی شاخ سے چمٹا ہوا تھا، اپنے حریف کے برچھوں اور گرز کی زد سے بمشکل چار پانچ فٹ بلند اور انہیں چار پانچ فٹ میں ملک الموت کی دسترس سے ہزاروں کوس باہر تھا۔ الامان والحفیظ، وہ غصہ میں شعلہ شوں کر رہا تھا جیسے جوالا مکھی آگ چھوڑنے سے قبل، اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ خوف کے مارے سارا ماحول لرزاں ہے۔

حالت بدلی، اور دو منٹ چپکے رہنے کے بعد مجھے اپنی پوزیشن بدلنی لازمی تھی، نشست بھی کرتی تھی لہذا شاخ کے اوپر کے رخ پر پہنچنے کے لئے کھبک کر پلٹا کھایا، اس بندہ گی سی حرکت میں رائفل کندھے سے اتر کر کلائی میں جھولی اور میں نے موقع کی نزاکت کے مطابق ہاتھوں سنبھالنے کی کوشش کی۔ مگر اتنی ہی کہ میں اس کے ساتھ خود نیچے نہ جا پڑوں، اور جب میں شاخ کے اوپر رخ پر پہنچ کر سنبھلا تو رائفل قلابازی کھا کر نیچے جا پڑا اور رائفل گرنے سے وہ یک دم بھڑک کر پانچ گز ادھر جا پڑا اور نیچے سے اوپر تک کا جائزہ لیا الاماں! برف کی سلاخ نے جیسے ریڑھ میں سے میرے تمام جسم میں ٹھنڈی لہریں دوڑا دیں، کیسی قہر آلود خونبار آنکھیں اور غضب ناک تیور تھے ظالم کے! اور ہر مرتبہ جب ماحول کو پوتال کر مجھ کو دیکھتا تھا تو آنکھوں میں سے سرخ سرخ چنگاریاں چیخ اٹھتی تھیں، اور غیض میں بپھر بپھر کر اگلے کھروں سے زمین کاٹتا تھا آہستہ آہستہ کینہ و غیض میں بھری ہوئی آواز نکالتا تھا۔

شاخ اوپر سے خاصی موٹی تھی اور درخت گر جانے کی وجہ سے جھک کر تقریباً متوازی سی شکل اختیار کر گئی تھی، یہ شاخ تو سوکھی ہوئی تھی لیکن درخت کی کچھ جڑیں ابھی زمین میں تھیں اور اس کے سبب کچھ شاخیں شاداب و نیم شاداب تھیں، اپنی اس پناہ گاہ پہنچ کر میں نے اپنی حالت کا جائزہ لیا تو مجھے تعجب ہوا کہ میں یہاں پہنچ کیسے گیا۔ اگر نیچے اس کے کوہ شکن حملوں کے وقت میری یہ حالت ہوتی تو کہیں پہ بھی خاتمہ تھا، پھر مجھے یہاں کیا ہو گیا۔ ابھی ابھی چند منٹ قبل بینتے کاٹ کاٹ کر جسم کے ایک ایک پٹھے ایک ایک نس سے پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کام لے کر جو اسپورٹس مین ایک ماہر پٹے باز کی طرح قوت اور فن کو بھرپور کام میں لا لا کر اس کا مقابلہ کر رہا تھا اور گولی پہ گولی مار کر اس کا خونی حملہ خالی دے رہا تھا اس وقت اس کے اعصاب اس قدر جواب دے چکے تھے کہ اس لٹھا جیسی چوڑی چکلی شاخ پر بیٹھ نہ سکتا تھا، تمام جسم میں رعشہ تھا، جو آہستہ آہستہ ترقی پذیر ہو رہا تھا اور جتنا میں اس کی جانب غور کر کے اس پر قابو پانا چاہتا تھا اتنا ہی یہ زیادہ ہوتا تھا اور ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کپکپاہٹ کی کسی شدید لہر میں الٹ کر نیچے نہ جا پڑوں، بہرحال بہت سنبھالنے کی بھی کوشش کی لیکن اتنی دیر کے مجادلہ اور حادثہ در حادثہ کا ردِ عمل اتنا شدید تھا کہ میں نے اندازہ کیا کہ محض ذہنی طور پر کوشش سے یہ حالت صحیح نہیں ہو سکتی دراصل ایسی تشنجی کیفیت میں کم از کم گھنٹہ بھر چارپائی پر پڑے رہنے کی ضرورت تھی اور

جب میں اپنی تمام تر ذہنی و نفسیاتی کوششوں کے باوجود اپنی حالت پر قادر نہ ہو سکا تو میں نے اپنی ڈری ڈری نگاہیں جن کے اندر اب وحشت کے بجائے علالت کی سی نشانیاں ابھر آئی ہوں گی درخت کے اوپر زیادہ مناسب نشست کی تلاش میں ڈالیں مگر باوجود تھوڑا بہت درخت پر چڑھنے کے فن سے واقف ہونے کے اس وقت کسی مناسب جگہ پہنچنا میری رسائی سے باہر تھا، مسلسل تھرتھراہٹ اور جوتے میں کسے ہوئے پاؤں، اور باوجود کوشش کے میری انگلیاں تو جوتے کا فیتہ بھی نہ کھول سکیں، بھلا درخت پر چلنا کیا معنی۔ تاہم چند گز اوپر اسی شاخ کے مخرج پر ایک مناسب جگہ نظر آئی جہاں پر شاید میں پہنچ سکوں، یہ وہ جگہ تھی جہاں ایک دوسری اتنی ہی موٹی شاخ کے ساتھ نکل کر دوسری جانب کو گئی تھی۔ اور یہاں پر ایک دوشاخے کی شکل میں بہتر سی نشست نظر آ رہی تھی۔ فاصلہ بھی زیادہ نہ تھا، راستہ بھی سیدھا اور کھردرا تھا، پھر مرتا کیا نہ کرتا ہمت کر ہی دی، اور میں نے ادھر کو بہت سنبھلتے ہوئے رینگنا شروع کیا لیکن جوں ہی اک ذرا حرکت کی تشنج مائل بہ سکون ہوا اور میں اس دوشاخے میں پہنچ گیا۔

جگہ دور سے دیکھنے میں جیسی مناسب نظر آ رہی تھی بیٹھ کر پتہ چلا کہ واقعی بہت معقول ہے دونوں کولہوں کو بھی ٹکنے کا ٹھکانا تھا، بازو بھی ٹک گئے اور تھوڑی ٹانگیں بھی پھیل گئیں، دوشاخے میں کمر کو بھی تکیہ مل گیا۔ کچھ رینگنے کی حرکت میں تشنج پر قابو ہوا کچھ اطمینان کی نشست ملی اب اپنے آپ کو پھر سے پرتالا، رائفل تو پہلے ہی داغ مفارقت دے گیا تھا اور اب پتہ چلا کہ سر سے ہیٹ اس سے بھی پہلے کسی جھاڑی نے اتار لیا تھا ماحول کو دیکھا تو اوپر کھلا آسمان تھا، نیچے زمین پر رائفل لیٹا ہوا تھا اور دور ایک جھاڑی پر احتیاط کے ساتھ ہیٹ ٹنگا ہوا تھا۔ جیبیں کارتوسوں سے پر تھیں، کلائیوں اور پنڈلیوں پر جگہ جگہ رگڑیں تھیں پتلون کا ایک پائنچہ پھٹا ہوا تھا۔ دل کی دھڑکنوں کا تو پوچھنا ہی کیا جب رعشہ ٹھہرا تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے جسم کی جان نکل گئی اور پھر ایسا معلوم ہوا کہ اعصاب مفلوج سے ہو گئے، اور وہ نیچے غصہ کے مارے زمین الٹے پھینکتا تھا ڈکرا ڈکرا کر چیلنج کر رہا تھا اگلے کھروں سے گھاس اور مٹی اکھیڑ اکھیڑ کر پھینکتا تھا، غیض میں بھر بھر کر دم لہرا لہرا کر ناچتا تھا، سر کو جھٹکتا تھا اور پھر نئی نئی بھیانک آوازوں میں چیختا تھا کچھ دیر تو میں نے اس کا اثر لیا پھر اپنی حالت کو ہر پہلو سے پرتالا، تھوڑی دیر بعد اندازہ ہوا کہ اعصاب بہتر ہیں اور مائل بہ سکون ہیں اور آہستہ آہستہ ایک قسم کے اطمینان کی لہر سی تمام جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور جان بچ جانے کا عظیم احساس اور پھر پہلی چیز جو یاد آئی وہ اپنا نیچے پڑا ہوا رائفل تھا۔ اور پھر موت کا رقص ناچتے ہوئے دشمن پر نگاہ گئی ہوں! خوب بنا بنا کر جھما رہے ہو بچّے، تقدیر کے اچھے ہو، رائفل لڑھک گیا، نہیں تو معلوم ہوتا کہ پڑا تھا کسی گل چلے سے پالا، بس یہ پوری جیب بھر کارتوسوں کی گولی گولی ملا دیتا آج، پہلے تو یہ دونوں آنکھیں ایک ایک کر کے پھوڑتا جن سے قہر بکھیر رہے ہو پھر ان چاروں گھٹنوں کی مینگ پاش پاش کر کے بہا دیتا، جن سے گھوم گھوم کر ہوا سے لڑ رہے ہو، اور یہ چبوترہ سی پیٹھ دو میگزین کی مار ہوں میں ایسی کتر جاتی جیسے آری کے دانتوں میں کوروں کا ٹھٹا اگر یہ گریہ کا جوڑ جوڑ بند بند بکھر چکا ہوتا اب تک اور دیکھتا کہ اس تمہارے پتھر کی چٹان سے ہو بڑے کی ہڈیاں کتنی مضبوط ہیں، اسی گھاس پر بھیجے کی پھٹکیں پھٹکیں پھیلی نظر آتیں۔ ساری بہادری الٹی ہو چکی ہوتی اب تک تو، اور پھر یکدم خیال آیا مگر تم سب کچھ تو کرتے لیکن کرتا کون، یہ تھرتھراتی انگلیاں یہ کپکپاتی چھاتی۔ یہ لرزتے ہاتھ پاؤں، کیوں نہیں چار گولیاں پیچھے انہیں نے تو ماریں۔ اور وہ تو جب رائفل ہاتھ میں ہوتا ہے تو فولاد کی لپک اور گولی کی تیزی آپ ہی آپ آ جاتی ہے۔

اور یہاں تک کہ غیض اور جذبۂ انتقام میں جو اضطراری حرکتیں وہ کر رہا ہے ان میں مجھے ایسا لطف آنے لگا جیسے سرکس کے اندر کسی جانور کو تماشہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ مسلسل شوں شوں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے طرح طرح کی ڈراؤنی اور کربناک آوازیں، جسم کی رگ رگ پھٹا پڑتا جیسے پورے تناؤ تک کھنچا ہوا اور رونگٹا رونگٹا حرکت ہی حرکت، تقریباً اسی طرح گھنٹہ بھر گزرنے کے بعد تندی میں کچھ کمی معلوم ہوئی، عجیب طرح سے اکڑا، اینٹھا اور شرابی کے سے قدم ڈالتا ترچھا ترچھا بڑھا اور چند قدم چل کر ایک گھنی جھاڑی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا، دو تین منٹ کھڑا رہا، چند نہایت بھیانک اور بلند ڈکاریں سی لیں، زمین سونگھی اور دو تین بار دُم اٹھا کر جہاں کا تہاں جکرایا اور وہیں پر بیٹھ گیا۔ اور مجھے وہ بات یاد آئی جو اسکے متعلق تجربہ کار شکاریوں کی زبانی سُنی تھی کہ جس وقت یہ انتقام لینے پر آتا ہے اور اس کا دشمن درخت پر پناہ لے لیتا ہے تو اس وقت تک

درخت کے نیچے بیٹھا رہتا ہے کہ دشمن سوکھ کر نیچے گر جائے۔ اور غصہ میں نہ اس کو بھوک لگتی ہے نہ پیاس، چاہے خود بھی سوکھ کر مر جائے غصہ نہیں اترتا۔ الاماں! اور اپنا یہی حشر مجھ کو نظر آیا۔

اور میں نے محسوس کیا کہ ماحول میں آہستہ آہستہ آگ سی بھڑک رہی ہے اور مجھ کو شدید پیاس لگی ہوئی ہے۔ میں نے کلائی پر نگاہ ڈالی تو گھڑی نہ تھی غالباً صبح باندھ کر ہی نہ چلا۔ سر پر جو کرنیں چھبیں تو ہیٹ غائب پایا اور تھوڑی دور ایک جھاڑی پر ٹنگا نظر بھی آ گیا۔ ماحول کی حرکت ترقی پذیر تھی، جنگل کے اندر سورج کی چال کا پتہ نہ چلا صرف گرمی سے ہی اندازہ ہوا کہ دس گیارہ بجے ہوں گے، ننگے سر، پیاس، اور مجھے تو آگے کی سوجھ رہی تھی، اور جوں جوں وقت گزرا اور بھی دور کی سجھائی دی یہاں تک کہ اس شاخ سے سیدھا ملک عدم کا راستہ دکھائی دے گیا، اور حساب لگایا، کہیں بارہ بجے تک میرا ساتھی افتاں و خیزاں بھاگ کر کیمپ پہنچے گا اور وہاں سے مجھ کو چھڑانے کے لئے کمک لیکر بہت جلدی یہاں تک پہنچا تو چار بجے تک ورنہ پانچ کے لگ بھگ، اور اب ساڑھے دس گیارہ کا وقت ہو گا، بس آج "دھانت" ہو جائے گا یہیں پر، جوں جوں وقت گذرا سورج کی کرنیں اقلیدس کے ہر زاویہ سے میری ننگی کھوپڑی اور جسم پر پڑ کر رونگٹے رونگٹے میں نفوذ کرتی گئیں، یہاں تک کہ میرے تمام وجود میں، میری روح میں حدت حلول کر گئی، پیاس کے مارے پیٹ میں انگارے سے دہکنے لگے۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور سوچا "ابھی سے یہ عالم ہے! اور پانی نہ معلوم کب ملے گا۔ اور کیا معلوم ملے گا بھی، یا یوں ہی پیاس اور لو کے مارے آم کی طرح کپو کے ٹپک پڑوں گا۔ اور سورج کا پہیہ اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا، وقت گرم ہو کر تپا اور تپ کر بھڑک اٹھا اور زمین سے لیکر آسمان تک ساری دنیا لپکتے شعلوں سے بھر گئی، اس درخت کے پاس پناہ تھی، مگر چلچلاتی ہوئی دھوپ سے نہیں اس بپھرے ہوئے عفریت سے، جو اب بھی اطمینان سے جہاں کا تہاں کینہ و بغض کی چٹان کی طرح جما ہوا منتظر تھا کہ کب میرا دشمن سوکھ کر ٹپکے اور کب میں اس کی سوختہ لاش کی دھجیاں بکھیر دوں اس کے مردہ جسم کا سرمہ بنا دوں۔ سورج کی کرنیں اور بھی زیادہ نکیلی ہو گئیں اور برچھیوں کی طرح براہ راست میری کھوپڑی میں اترنے لگیں، میں نے اوپر نگاہ کی تو آسمان جیسے لال تودے کی طرح دہکتا نظر آیا نیچے دیکھا تو زمین پر بھٹی سی بھڑک رہی تھی دائیں بائیں نظر کی تو نیچے سے اوپر کو دھواں سا اٹھ اٹھ کر جلتا دکھائی دیا اور مجھے سچ مچ ایسا محسوس ہوا کہ میں تندور میں بیٹھا ہوں، اور اس سب کے ساتھ مجھے اپنا انجام نظر آیا۔ ٹھہر ٹھہر کر لو کے جھکڑ چل رہے تھے، چرندے پرندے سب کھا پی کر آسودہ ہو چکے تھے اور پیاس کے مارے میری زبان باہر آ گئی میں نے ذرا پہلو بدلا اس عفریت کی جانب دیکھا، عنقریب یہ تشنگی اور موسم کی حالت مجھ کو یہاں سے اوندھے منہ نیچے پٹخ دے گی اور یہ میری۔ سوختہ لاش پر اپنی حسرتیں پوری کرے گا اور میری انتڑیاں اس کے برچھا سے سنگوں پر لپٹ جائیں گی باقی جسم اس کے گرز جیسے سر سے پس جائے گا۔ اور مٹی اور گھاس پر کچھ نشانیاں باقی رہ جائیں گی جو میرے ساتھی اگر قیمہ کی پوٹ کی شکل میں لپیٹ کر یہیں دفن کر دیں گے۔" اور یہاں پہنچ کر جیسے اندر سے ردعمل اور مقابلہ سا ہوا۔ میں نے پھر پہلو بدلا، اور جیسے انجام سے بچنے کے لئے سنبھلا۔ اپنے کھوئے کھوئے سے حواس مجتمع کئے اور اپنا گہرا جائزہ لیا۔ آنکھوں کے آگے کسی وقت سیاہ چادر اور کبھی نیلی سرخ تنکیاں اڑتی ہیں۔ کھوپڑی اوپر سے بھڑک رہی ہے، اور اندر جیسے چاول پک رہے ہیں۔ نتھنوں سے لپٹیں نکل رہی ہیں۔ آنکھوں کو حرکت دیتا ہوں تو چنگاریاں سی چھٹتی ہیں۔ پیٹ میں بار بار پگھلا سیسہ پھڑ پھڑاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میرے نہیں جیسے کسی اور کے ہیں جو میرے جسم میں لگے ہیں۔ کسی کسی وقت دم گھٹتا ہے۔ کوئی چیز حلق میں ٹک ٹک کلاک کی طرح بجتی ہے۔ بار بار چکر سا آتا ہے۔ ارے کہیں میں نیچے نہ گر پڑوں! ۔ اور میں پھر اپنی نشست پر سنبھلا، بار بار پلک مار کر بصارت کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ زبان ہونٹوں تک تو آ گئی مگر نمی نہ تھی جو ذرا تر ہو جائے۔

اور میں نے محسوس کیا کہ بڑا میٹھا میٹھا خمار ہے اور ہلکا ہلکا چکر سا آ رہا ہے۔ پھر گرمی، لپٹ۔ شاید یہ جہنم کا کوئی طبقہ ہے۔ میں اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اور میں نے پھر سنبھل کر پہلو بدلا۔ مگر میں مرا تو نہیں ہوں۔ اور نہ مجھے بخار ہی چڑھا ہے۔ میں اپنے دماغ پر سرسامی کیفیت طاری نہ ہونے دوں گا۔ یہ جنگل ہے۔ آج صبح میں یہاں شکار کو آیا تھا۔ ہوں، ہوں، میں بے ہوش ہرگز نہ ہوں گا۔ میں اس

درخت سے نیچے نہیں گرونگا میں یہیں سوکھ کر مرجاؤنگا۔ نہیں نہیں میں نہیں مرونگا۔ میں اس کو مارونگا۔ میں اس کا قیمہ بنا کر کھاؤں گا۔ اس کی ہڈیوں کا گودا نکال کر چوس جاؤنگا۔ اس کا کھوپڑا توڑ کر بھیجا بھون کر کھا جاؤں گا۔ شاید دن لوٹ گیا اور سہ پہر آ لگا۔ جیسے میرے کانوں میں کچھ آواز سی گونجی۔ یہ اندر کی ہذیانی آواز ہے یا کہیں باہر سے آ رہی ہے میں نے تمیز کرنا چاہا مگر قطعی طور پر سمجھ نہ سکا، میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان دبا لئے تو آواز بند ہوگئی اور جب ہٹائے تو پھر زیادہ واضح سنائی دینے لگیں اور صاف معلوم ہونے لگا کہ یہ ادھر ہی سے آ رہی ہیں جدھر سے کمک آنے کی امید ہو سکتی تھی اور چند منٹ کے اندر نہایت نمایاں شکاری سیٹیاں بجتی سنائی دیں جو مخصوص آواز میں اپنی آمد کی اطلاع کی ہوتی ہیں، اور پھر آوازیں بڑھتی رہیں، میری ساری سرسامی سی کیفیت کافور ہوگئی، نیم وا آنکھیں بھرپور کھل گئیں، پیاس بھی غائب ہوگئی اور گرمی کا احساس بھی جاتا رہا اور یہ اندیشہ ہوا کہ اگر انہیں اس عفریت کی جائے قیام کا صحیح پتہ نہ چلا اور یہ اسی طرح پھیلے ہوئے بڑھتے ہوئے چلے آئے تو کہیں یہ ان پر حملہ نہ کر دے لہٰذا انہیں اسکی جگہ بتا دینا بہت ضروری ہے ان کی آوازیں قریب سے سنائی دے رہی تھیں سیٹیوں کے ساتھ بت بتاہٹ بھی کان میں آ رہی تھی۔ میں نے چاہا کہ چلا کر بتا دوں کہ یہ یہاں بیٹھا ہے۔ مگر بولتا کاہے سے زبان کی جگہ مُنہ میں لکڑی کا ٹکڑا رکھا ہوا تھا اور حلق میں میخ سی ٹھکی ہوئی تھی۔ اور پھر خیال آیا یہ سیٹیاں جو بج رہی ہیں یہ خاص صاحبزادگان کی ہیں ایسی آواز والی سیٹیاں کیمپ پر نہیں تھیں یہ لوگ اپنے ساتھ لائے ہونگے یقیناً وہ خود آ رہے ہیں یہ غضب ہی ہوجائے گا۔ اگر یہ لوگ بے خبری میں بڑھتے چلے آئے اور اس نے حملہ کر دیا۔ نہ معلوم کون کونسی قیمتی جانیں خطرہ میں ہیں۔ اوہ! اب تو بہت قریب ہی ہیں۔ اور ادھر ہی کو بڑھ رہے ہیں۔ میں نے پھر خطرہ سے آگاہ کرنے کی کوشش کی مگر زبان کی نمی کیا خشک ہوئی تھی جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ میں نے لاچار ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا، اور نیم خشک درخت کی شاخ پر ایک گچھا ہری کونپلوں کا نظر آیا مٹھی میں بھر کر کھسوٹ لیا۔ اور مُنہ میں بھر لیا۔ مگر جبڑوں نے چبانے کا یارا نہ دیا بڑی مشکل سے اگلے دانتوں سے کُتر کُتر کر چبایا کچھ نمی ذرا سی بھبن پیدا ہوئے دوسری مٹھی کھسوٹ کر اور مُنہ میں بھر لی۔ اب کی مرتبہ جبڑے بھی چلے اور منہ بھبنوں سے بھر گیا اور کسیلے کھٹے مندرے عرق سے ہونٹوں سے لیکر حلق تک تمام تر ہو گیا اور زبان چل نکلی، آواز دے کر انہیں متنبہ کیا کہ یہ اس سمت بیٹھا ہوا ہے اور جب اپنے بائیں ہاتھ پر نگاہ ڈالی تو یہ جماعت جنگل کے عین اس گوشہ سے نمودار ہوئی جہاں سے میں نے پہلی مرتبہ گلہ دیکھا تھا اب میں نے زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ کے اشارے سے بھی بتایا۔ ہاتھوں میں رائفل اور گلوں میں دوربینیں لٹکائے وہ میری ہدایت کے مطابق خوب چکر کاٹ اِدھر پہنچ گئے جدھر سردار پر میرا پہلا فیر ہوا تھا، اور باوجود میرے مبہم اشارہ کرکے بتانے کے دوربینوں سے بھی نہ دیکھ سکے کہ سانڈ کہاں پر بیٹھا ہے البتہ یہ سمجھ گئے کہ یہ میرے بائیں ہاتھ پر ہیں اور وہ کہیں داہنے ہاتھ پر، جماعت میں چالیس دیہاتی دل چلے بھالا اور برچھے لئے ہوئے تھے بقیہ چھ صاحبزادگان اور وہ ان کے مہمان اور شکاری خاں تو شکاری بھاری بور کے دونالے رائفلوں سے مسلح تھے۔

اور ایک دم بہت سے آدمی چلا پڑے ”ارے یہ تو یہ پڑا ہے مرا ہوا“

”کیا بکتے ہو۔ وہاں کہاں ادھر ہے بتا رہا ہوں“ میں نے گلا پھاڑ کر اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

وہ سب کے سب جمع ہوگئے اور چند منٹ باتیں کرنے کے بعد بقیہ آدمیوں کو وہیں چھوڑ کر یہ نو اِدھر بڑھے، اٹھارہ نالیں بھرے ہوئے۔ رائفلیں تانے اور بڑھتے بڑھتے میرے درخت تک آ گئے وہ پھر بھی نہ اٹھا یہ لوگ دو قدم اور آگے کو سرکے، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو شکاری خاں نے ڈپٹ کر چیلنج کیا، ”ڈیہہ، ڈیہہ“، سب رائفل کندھوں پر تھے پہلی ہی حرکت پر اٹھارہ گولیوں کی باڑ پڑتی مگر وہ تو اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں، یہ لوگ اور بھی زیادہ مستعدی اور ہوشیاری سے بڑھے اور جب پانچ گز کا فاصلہ رہ گیا تو شکاری خاں نے بڑے زور سے للکار کر پتھر مارا اور سب نے اپنے رائفل اٹھا لئے مگر وہ پھر بھی جوں کا توں ڈھیر سا وہیں پڑا رہا تو شکاری خاں نے ذرا تمسخرانہ انداز میں للکارتے ہوئے اچھل کر اسکی دم پکڑ لی اور سب کے منہ سے بیک وقت لاحول ولا قوۃ نکلا سب دوڑ کر قریب پہنچے ”لو صاحبزادگان۔ یہ تو اکڑا پڑا ہے جبھی کا مرا“ شکاری خاں نے خوشی میں بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور صاحبزادگان قریب جا کر ناک پر رومال رکھے ”ہیں ہیں اونہہ اونہہ تعفن پیدا ہو گیا، سڑ گیا نہ معلوم کب کا مرا ہے“ کہتے ہوئے دور ہٹ آئے۔

شکاری خاں نے کہا "آٹھ نو گھنٹے ہو گئے مرے ہوئے سڑنے کو رہ جائے گا اب تک"۔

ادھر سے برچھے تھامے دیہاتی آگئے اور شکاری خاں سے پوچھا "خان صاحب، وہ اُدھر وہ بڑا تو سڑ کر پھُوں بھی گیا، یہ اِدھر ذرا چھاؤں میں تھا اس میں کچھ دم ہے"۔ اور گوشت کے لالچ میں سب کی مرے ہوئے سانڈ پر حریصانہ نگاہیں پڑیں۔

"وہ پھول گیا یہ پھول رہا ہے، دم کیسا، بالکل سڑ گیا، اب گِدھ پڑتے ہیں، کدھر ہی سے" اور پھر بڑبڑایا "آج یہ بیس پچیس من گوشت سڑ گیا، اور سرکاروں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا ہے، ہوں اِدھر ہیں پہنچا، اُدھر سواری آئی، یہ کبھی نہیں کسی نے اچھی طرح بیٹھ کر پانی بھی پیا ہو۔ بس سنتے ہی دوڑ پڑے سب کے سب اِدھر۔ ہوں اب رات کے کھانے پر بھی کباب نہیں ہوں گے"۔

"ارے بے ایمان، باتیں مار رہا ہے ارے اب مجھے اتارئیں مر رہا ہوں، سرکنے کی بھی سکت نہیں۔ نیچے ٹپک پڑوں گا" میں نے کہا اور اندازہ کیا کہ میری زبان بڑے تڑاقے سے چل رہی ہے۔ دو آدمیوں نے اوپر سے سہارا دیا دو تین آدمیوں نے نیچے سے سنبھالا اور ایک جانب لے جا کر گھاس پر لٹا دیا۔ سب لوگ جمع ہو گئے، مہمانوں میں ایک ڈاکٹر بھی تھے۔ انہوں نے بڑی پابندی لگائی، مرے کو ماریں شاہ مدار، میری نبض دیکھی قلب کی حرکت ٹٹولی آنکھیں چیر کر دیکھیں اور پیٹ ٹٹولا اور مجھ کو پانی دینے میں بڑی احتیاط کی، پہلے تھرموس میں سے برف نکال کر پانی کے قطرے حلق میں چوائے، پھر ایک چھوٹا گلاس سنترہ کے عرق کا دیا، پھر دو بسکٹ بڑھا دیئے جو میں نے بڑی مشکل سے کھائے، پھر ذرا سا سنترہ کا عرق دیکر پندرہ منٹ صبر کرنے کا حکم دیا۔ اور میرا یہ عالم تھا کہ چار چھ مشک پانی یک دم پی جاؤں۔ انہوں نے اس دوران میں برف کے پانی میں تر کر کے چہرہ پر رومال پھیرا، یا اللہ یہ پندرہ منٹ پندرہ برس ہو گئے۔ پھر دو بسکٹ اور ایک چھوٹا گلاس پانی کا بڑھایا۔ پھر دس منٹ صبر اور پھر دو بسکٹ اور ایک گلاس شربت۔ تقریباً پون گھنٹے تک مجھ پر پابندیاں لگاتے رہے، ایک دوا بھی پلائی، اور پانی جیسے میری رگ و پے میں اترتا چلا گیا اور رونگٹے رونگٹے پر جھلک اٹھا، آٹھ سات گلاس پانی اور تقریباً ایک پیکٹ بسکٹ پیٹ میں پہنچنے کے بعد میں نے شکاری خاں سے پہلا سوال کیا "بڑے سانڈ کے گولی کہاں پر پڑی تھی؟"

بس ایک کان کے پیچھے، اور کلیان ہو گیا۔ گردن اور سر کے جوڑ کا گر یہ توڑ کر معلوم ہوتا ہے سیدھی بھیجے میں جا کر دھر رہی بس جہاں کا تہاں دھرا رہ گیا، پسر بھی نہ ملا، جیسے بتاشہ پر پانی کی بوند آپڑی۔ بس دو چار مرتبہ دم تو ہلی معلوم ہوتی ہے، مٹی پر نشان تھے، اور کچھ نہیں سانس بھی نہ لی"۔

"اور شکاری خاں، یہ شیطان چار گولیاں کہاں ہضم کر گیا؟" میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور سانڈ کی سڑی ہوئی لاش کو دور سے دیکھنے لگا۔

شکاری خاں منہ پر رومال رکھے اس کے قریب پہنچ گیا اور ایک چھڑی سے اشارہ کر کے بتانا شروع کیا "گردن کے اوپر، موٹے پٹھے پر ایک سیدھے بھوے پر دو۔ پیٹ پر تین۔ پسلیوں کے جوف میں چار۔ اور معلوم ہوتا ہے یہی کام کر گئی، یہ پڑی تو پیچھے سے ہے مگر دو پسلیوں کے بیچ میں کھال تو اڑتی آگے کو نکل چلی گئی اور سینہ میں پہنچ کر کہیں پھیپھڑے وغیرہ چیر دیئے، اور مار گئی"۔

"ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ جس وقت جا کر بیٹھا ہے وہاں پر اسی وقت مر گیا" میں نے کہا۔

"اجی گیا ہی مرنے کو تھا، یہ دیکھو نا، منہ سے چار مشک خون پھینکا ہے، یہ جھاڑی کی جڑ میں جمع ہو گیا ہے، سوکھ گیا ہے، بس صبح ہی کا ہے، اور خون پھینکتے ہی مر گیا"۔

"ہوں وہ وہاں پڑا اور یہ یہاں پر، دھرا رہ گیا اور کبابوں کا ایک پارچہ نہ نصیب ہوا" میں نے اپنا صبح کے پروگرام کی اصل غایت یاد کر کے کہا۔ اور صاحبزادے صاحب ہنس پڑے اور فرمایا "خیر جو ہوا سو ہوا اپریل فول آج خوب بنا گیا آپ کا یہ مرتے مرتے۔ ایک قہقہہ پڑا اور جانے کے لئے تیاری ہو گئی۔ کیمپ یہاں سے چھ میل سیدھے راستے تھا لوگوں نے چاہا کہ مجھے اٹھا لیں، مگر میرے پاؤں میں نہ معلوم کہاں کی قوت آگئی تھی سب کے ساتھ آہستہ آہستہ چل پڑا۔ رائفل جو ہاتھ میں آگئی تھی۔

غلام عباس (ماہ نو، کراچی)

فرار

اس شام میں کلب جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ میری بیوی میرے پاس آئی اور تشویش کے لہجے میں کہنے لگی۔
"ابھی ابھی نانا جان کے ہاں سے پیغام آیا ہے۔ سرفراز ماموں کی حالت یک لخت بہت بگڑ گئی ہے۔ امید نہیں وہ آج کی رات بھی کاٹ سکیں۔ ہم سب کو فوراً بلایا گیا ہے۔"

سرفراز ماموں ہمارے وسیع کنبے کے قریب قریب ہر فرد کے بڑے محبوب تھے۔ ان کی عمر پچاس برس کی ہو چکی تھی۔ مگر ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ ابھی پچھلے دنوں میری والدہ نے بڑے اہتمام سے اُن کی سال گرہ منائی تھی۔ وہ دعوت میں بڑے چہک رہے تھے اور چھوٹے بڑے ہر ایک پر پھبتیاں کہہ رہے تھے۔ مگر اس دعوت کے اگلے ہی روز وہ اچانک بیمار ہو گئے۔ کچھ عجیب ہی سا مرض تھا جسے ڈاکٹر یا حکیم کوئی بھی ٹھیک طور پر تشخیص نہیں کر سکا۔ ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی۔ وہ بے حد کمزور ہو گئے۔ ہر شخص کے دل سے ان کی تندرستی کے لئے دعا نکلتی تھی۔ مگر مرض میں کچھ افاقہ نہ ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔

میری بیوی نے جلد جلد بچوں کے کپڑے بدلے۔ خود بھی لباس تبدیل کیا اور تھوڑی ہی دیر میں ہم نانا جان کے ہاں پہنچ گئے۔

میرے سب بھائی بہن اور دوسرے عزیز و اقارب پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ میری والدہ جو میرے والد کے انتقال کے بعد زیادہ تر ننھال ہی میں رہنے لگی تھیں۔ سرفراز ماموں کو بہت چاہتی تھیں۔ انہیں اپنے چھوٹے بھائی کی علالت کا سخت صدمہ تھا۔ وہ غم سے نڈھال ہو رہی تھیں مگر ضبط کئے ہوئے تھیں۔ انہوں نے بڑی جاں فشانی سے ماموں کی تیمارداری کی تھی۔ مگر ان کی جان نہ بچا سکی تھیں ان سے معلوم ہوا کہ میرے ضعیف نانا نانی اس صدمے کی تاب نہ لا کر حواس کھو بیٹھے ہیں۔ انہیں ان کے کمرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ اور کسی کو ان سے ملنے جلنے نہیں دیا جاتا۔

جس کمرے میں سرفراز ماموں بستر مرگ پر پڑے تھے اس میں ان کی مسہری کے علاوہ صرف ایک چھوٹی میز دوائیں وغیرہ رکھنے کے لئے اور ایک کرسی ڈاکٹر کے بیٹھنے کے لئے رہنے دی گئی تھی، باقی سامان اٹھوا دیا گیا تھا۔ سرفراز ماموں طبعاً بڑے خوش خلق اور ملنسار تھے۔ مگر اس بیماری نے رفتہ رفتہ انہیں سخت تنک مزاج بنا دیا تھا۔ وہ میری والدہ کے سوا اور کسی کا اپنے پاس آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کہتے "للہ مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

بیماری کے آخری ایام میں تو ان کی تنہائی پسندی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ انہوں نے تمام کانسی اور پیتل کے مجسمے، عورت مرد کی تصویریں، قدرتی نظارے، یہاں تک کہ خوش خطی کے مرقعے بھی اپنے کمرے سے نکلوا دیئے تھے۔ کہتے ان سے ذہنی سکون میں

خلل پڑتا ہے۔

اقربا کے بیٹھنے کے لئے ملحقہ کمرے میں انتظام کیا گیا تھا۔

میرے تینوں بھائی، دونوں بیاہتا بہنیں اور ان کے بچے اسی کمرے میں جمع تھے جن میں ہم بھی شامل ہو گئے۔ ہم دو دو تین تین مل کر دبے پاؤں سرفراز ماموں کے کمرے میں جاتے اور تھوڑی دیر ان کی مسہری کے پاس کھڑے رہ کر دبے پاؤں واپس آجاتے۔

سرفراز ماموں پر اس وقت غشی طاری تھی۔ دیر سے انہوں نے آنکھ نہیں کھولی تھی۔ ہر چند ڈاکٹر جواب دے گئے تھے مگر ابھی تک کئی لوگوں کو امید تھی کہ شاید وہ بچ جائیں۔ قریب ہی کے ایک اور کمرے میں قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ اور ان کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگی جا رہی تھیں ۔۔۔ ایک بار ان کے کمرے کو خالی دیکھ کر میں اکیلا ہی اندر چلا گیا۔ تاکہ ایک مرتبہ اور انہیں جی بھر کر دیکھ لوں۔ وہ بچپن میں مجھ پر خاص طور سے شفقت فرماتے تھے اور سب سے زیادہ میری فرمائشیں پوری کیا کرتے تھے اور ادھر میں بھی ان سے کچھ زیادہ ہی مانوس تھا۔ وہ مسہری کے درمیان چت لیٹے ہوئے تھے صرف ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ باقی سارا جسم ایک سیاہ پشمینے کی ہلکی چادر سے، جس کے کناروں پر چھوٹی بوٹی کی سرخ خوشنما بیل کڑھی ہوئی تھی، ڈھکا ہوا تھا۔ انہوں نے پچھلے دو تین ہفتوں سے ڈاڑھی نہیں منڈائی تھی، اس کی وجہ سے ان کے رخساروں پر ایک چھوٹی سی کرڑبڑی ڈاڑھی نکل آئی تھی۔ جو کمرے کی مدھم روشنی میں ان کے گندمی رنگ کے چہرے پر بہت بھلی لگتی تھی۔

میں ان کی مسہری کے اور قریب پہنچ گیا۔ اور ان کے چہرے کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔ ہر چند ان کی آواز نے جواب دے دیا تھا مگر ابھی تک ان کا سانس بگڑنے نہیں پایا تھا، ان کے چہرے سے ایک عجیب طرح کی آسودگی ٹپکتی تھی۔ کسی قسم کے کرب کا نشان نہ تھا۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ چین سے سو رہے ہیں۔

میں ان کے چہرے کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور ایسا معلوم ہوا جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر تک یہی کیفیت رہی۔ رفتہ رفتہ ان کی آنکھوں کا تجسس غائب ہونے لگا اور اس جگہ ایک خفیف سی مسکراہٹ جھلکنے لگی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ انہوں نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اس لمحہ میں بھی اپنا غم بھول گیا اور مسکرانے لگا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان کی مسکراہٹ ان کی آنکھوں سے نکل کر ان کے ہونٹوں اور رخساروں پر پھیل گئی۔ بلاشبہ یہ ان کی وہی مخصوص مسکراہٹ تھی جس میں ہمیشہ شرارت کا ایک خفیف سا عنصر چھپا رہتا تھا۔

اس کے بعد دھیرے دھیرے ان کی آنکھیں بند ہوتی گئیں، اور وہ مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ میں جلد ہی ان کے کمرے سے چلا آیا۔ اس ملاقات کا میرے دل پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ مجھے اپنے جذبات پر قابو نہ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو امڈے آتے تھے۔ اس خیال سے کہ میری بہنیں اور خاص طور پر میرے بیوی بچے میری اس کمزوری کو دیکھ کر پریشان نہ ہوں، میں چپکے سے کوٹھی کے باہر نکل آیا اور باغیچے میں ٹہلنے لگا۔

سرفراز ماموں کی اولین یاد جو میرے دل میں ابھری اس وقت کی تھی۔ جب میں پانچ چھ برس کا تھا ۔۔۔ اور وہ پچیس سال کے نوجوان تھے وہ بہت عمدہ عمدہ کپڑے پہنا کرتے اور بڑے بنے سنورے رہا کرتے تھے وہ اکثر اپنی بہن سے ملنے آیا کرتے تھے جو عمر میں ان سے پانچ سال بڑی تھیں۔ ہم بھائی بہن جیسے ہی برآمدے میں ان کی آواز سنتے، جہاں کہیں بھی ہوتے اڑ کر ان کے پاس آ پہنچتے، اور ان سے لپٹ جاتے۔ وہ ہمارے لئے طرح طرح کی چوسنے والی مٹھائیاں، ٹافیاں، پستہ بادام اور کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے کھلونے لے کر آیا کرتے۔ یہ چیزیں وہ اپنی مختلف جیبوں میں سے نکال نکال کر ہمیں دیا کرتے۔ اور بہت خوش ہوتے۔ مٹھائی اور کھلونوں کے علاوہ کئی اور طریقوں سے بھی ہمارا دل بہلایا کرتے۔ وہ ہمیں جادو کے کھیل دکھاتے۔ جنہیں دیکھ کر ہم دنگ رہ جاتے کہانیاں سناتے جنہیں سن کر بڑی ہنسی آتی۔ وہ ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے۔ اور کبھی کبھی ہمارے اصرار پر ہمیں گانا بھی سناتے۔ ان کا یہی وطیرہ اپنے بھائیوں اور دوسرے اقربا کے بچوں کے ساتھ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے خاندان کے سارے بچے ان کے بے حد گرویدہ تھے۔

بچوں کے علاوہ بڑے بھی ان سے ملنے کے مشتاق رہتے تھے۔ مگر ان کے پاس وہ زیادہ دیر نہ ٹھہرتے۔ بس چند منٹ رسمی باتیں کرکے کسی بہانے سے کھسک جاتے۔

میں نے اب تک سرفراز ماموں کی خوبیاں ہی گنوائی ہیں۔ مگر ان میں برائیاں بھی کئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اول درجے کے سُست تھے اور محنت سے بہت جی چراتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے دونوں بڑے بھائی تو کبھی کے گریجویٹ ہوکر اونچے اونچے عہدوں پر پہنچ گئے۔ اور یہ برسوں اسکول ہی میں لٹکے رہے اور آخر میٹرک کئے بغیر ہی انہیں تعلیم ختم کر دینی پڑی۔ لطف یہ کہ وہ کُند ذہن نہیں بلکہ بڑے ذہین تھے۔ بس ایک ذرا لکھنے پڑھنے میں ان کا جی نہیں لگتا تھا۔

دوسرا عیب ان میں یہ تھا کہ وہ حد درجہ کے ڈرپوک تھے۔ جھگڑے فساد کا تو کیا ذکر جہاں ذرا گھر کے اندر یا باہر کوئی طیش میں آکر اونچی آواز میں بولنے لگا۔ یہ وہاں سے کھسکے، تیسرے حضرت لپاٹیے بھی غضب کے تھے۔ اور گپ تو ایسی ہانکتے کہ جس کا سر ہوتا نہ پیر۔ پھر انہیں ورزش سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب تک اسکول میں رہے کسی قسم کے کھیل میں حصہ نہیں لیا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ وہ قدرتی طور پر پیدا ہی دبلے پتلے اور کمزور ہوئے تھے۔ یہ کمزوری بڑے ہوتے پر بھی قائم رہی۔ چنانچہ ان کے دونوں بھائی تو خوب کڑیل جوان نکلے مگر یہ دھان پان ہی رہے۔

نانا جان کو اپنے چھوٹے بیٹے کی تعلیم اور دنیاوی ترقی میں اپنے بھائیوں سے پیچھے رہ جانے کا افسوس تو ہوا، لیکن ان کی شفقت میں ذرا فرق نہ آیا۔ بلکہ وہ اس کی کچھ زیادہ ہی دل جوئی کرنے لگے۔ وہ خدا کے فضل سے آسودہ حال اور صاحب جائداد تھے۔ آراضی کے علاوہ ان کے متعدد مکان اور دکانیں تھیں جن کے کرائے کی ہر مہینے ایک معقول رقم آیا کرتی تھی۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ سرفراز کو اپنی کم علمی کی وجہ سے کوئی مناسب سرکاری نوکری تو ملنے سے رہی اور نہ وہ کوئی کاروبار ہی کر سکتے ہیں، ان کے ذمے یہ کام تفویض کر دیا کہ وہ جائداد کا کرایہ اگایا کریں۔ اور آمدنی اور خرچ کا حساب رکھا کریں۔ اس کام کے عوض میں ان کا ایک معقول مشاہرہ مقرر کر دیا گیا۔

یہ کام اُن کی سُست اور آرام طلب طبیعت کے لئے بہت موزوں تھا، انہیں نہ تو دفتر جانا پڑتا، نہ کسی قسم کی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی۔ بس مزے سے گھر ہی میں رہتے یا اپنے عزیزوں کے ہاں چلے جاتے اور ان کے بچوں کے ساتھ اپنا وقت گزارتے۔ اس پر بھی ان کی یہ حالت تھی کہ جب دیکھو چہرے سے تکان برس رہی ہوتی، ہائے وائے کرتے۔ اور کہتے "چلو بچو۔ ذرا میرے ہاتھ پاؤں تو داب دو" وہ ہمارے لئے مٹھائیاں وغیرہ تو لایا ہی کرتے تھے، مگر جب ہم سے مٹھی چپی کی خدمت لینی ہوتی، تو اس کے صلے میں ایک الگ تھیلے میں بہت سی چیزیں بھر کر لاتے۔ ہم ان کے ساتھ کسی الگ تھلگ کمرے میں چلے جاتے وہ اپنی شیروانی اتار دیتے اور بستر پر چت لیٹ جاتے۔ پھر کوئی بچہ ان کے بازو دباتا۔ کوئی ان کی ٹانگوں پر کھڑے ہوکر چلتا۔ کوئی سر میں تیل ڈال کر انگلیوں سے سہلاتا۔ اور وہ ایک ایک دو دو منٹ کے بعد سب کو ٹافیاں، رنگترے کی پھانکیں، اور دوسری چوسنے والی مٹھائیاں بانٹتے رہتے۔ یہ سلسلہ بعض اوقات گھنٹوں جاری رہتا۔ ہم لوگ مٹھائیوں کے لالچ میں تھکنے کا نام نہ لیتے۔ اور اُدھر وہ انعام و اکرام کی بارش جاری رکھتے۔ ہماری اس خدمت گزاری سے ان کے تھکے ہوئے اعضاء کو یقیناً آرام پہنچ رہا ہوتا۔ کیونکہ ان کے پژمردہ چہرے پر آہستہ آہستہ بشاشت آتی جاتی اور ان کی آنکھیں جو پہلے بجھی بجھی ہوتیں روشن ہوجاتیں۔

آخر وہ کہتے "بچو۔ اب بس کرو، شکریہ بہت شکریہ"

پھر وہ غسل خانے میں جاکر منہ ہاتھ دھوتے، شیروانی پہنتے اور ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرتے اور جلد ہی پھر آنے کا وعدہ کرتے ہوئے چلے جاتے۔ ہم جب امی سے یہ واقعہ بیان کرتے تو وہ ہنستیں اور کہتیں "بے چارہ سرفراز"

سرفراز ماموں اپنی اس آسودہ زندگی سے بہت مطمئن تھے۔ لیکن اب بڑی مشکل یہ آپڑی کہ نانا جان کو ان کی شادی کی فکر ہوئی۔ ان کے لئے جگہ جگہ رشتے ڈھونڈے جانے لگے۔ مگر ان کے سامنے جس لڑکی کا نام لیا جاتا۔ جھٹ اُسے رد کر دیتے۔ کہتے "ابھی کیا جلدی ہے۔ جب وقت آئے گا۔ تو میں خود کہہ دوں گا"

مگر مہینے اور سال گزرتے جاتے تھے اور وہ وقت نہیں آنے پاتا تھا۔ نانا جان سخت فکرمند رہنے لگے تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹوں کی طرح ان کا گھر بھی رستا بستا دیکھ لیں مگر وہ راضی ہی نہ ہوتے تھے۔ مگر اب والدہ کی آزردگی انہیں بھی کسی قدر پریشان کرنے لگی تھی۔

اسی زمانے کا ذکر ہے۔ ایک دن شام کو وہ گھر آئے تو بہت چُپ چاپ اور سنجیدہ صورت بنائے ہوئے تھے۔ ان کے والد اور بڑے بھائیوں کو تعجب ہوا۔ پوچھا کیا بات ہے۔ یہ خاموش رہے۔ مگر صورت پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ بنالی۔ اس پر انہوں نے اصرار کیا۔ تو وہ یوں گویا ہوئے۔

"آپ روز روز کہا کرتے تھے۔ لیجئے میں نے رشتہ تلاش کر لیا ہے"

اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ وہ گذشتہ شام نمائش دیکھنے گئے تھے۔ وہاں اتفاق سے انہوں نے ایک لڑکی کو جو اپنے والدین کے ہمراہ آئی تھی۔ بے پردہ دیکھ لیا۔ بس اسی وقت سے اس کی صورت ان کے دل میں ایسی بس گئی ہے کہ کسی طرح محو نہیں ہوتی۔ انہوں نے ڈرائیور کو انعام دے کر اس کے والد کا نام اور پتہ بھی پوچھ لیا ہے۔ وہ اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔

"کیا نام ہے؟" نانا جان نے پوچھا۔

"نواب ظہیر الدولہ" سرفراز ماموں نے نام کے ایک ایک جز پر زور دیتے ہوئے کہا۔

یہ نام سننا تھا کہ نانا جان اور ہمارے دونوں بڑے ماموں حیران پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ سرفراز ماموں خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اس کے بعد ان کی تمام خوش طبعی اور زندہ دلی جیسے ایک دم رخصت ہو گئی۔ کھانا پینا بھی برائے نام ہی رہ گیا۔ انہوں نے اپنے عزیزوں کے گھروں میں آنا جانا بھی موقوف کر دیا۔ وہ سارا سارا دن اپنے کمرے میں بند، بستر پر پڑے رہا کرتے۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر ایک دن ہماری نانی جان نے اپنے شوہر سے کہا۔

"نواب ظہیر الدولہ بڑے آدمی سہی۔ ان کا خاندان بھی اونچا سہی لیکن پیغام تو بھیج کر دیکھو"

نانا جان نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر نانی جان نے خود ہی شہر کی دو تین مشاطاؤں کو جو رشتے کرانے میں مشہور تھیں، اپنے ہاں بلوایا، اور اُن سے صلاح مشورہ کیا۔ پھر بسم اللہ کر کے ایک مغلانی کے ذریعہ پیغام بھیج ہی دیا۔

ایک ہفتہ کے بعد وہاں سے جواب آیا کہ نواب صاحب خاندان کی بلندی و پستی کے زیادہ قائل نہیں ہیں۔ مگر ان کے ہونے والے داماد کے لئے کم از کم یہ شرطیں ضروری ہیں، ایک تو وہ اچھی شکل و صورت کا ہو۔ دوسرے کم از کم گریجویٹ ہو۔ اور تیسرے اس کے والدین اس قدر آسودہ ضرور ہوں کہ وہ پانچ لاکھ روپیہ نقد بطور حق مہر لڑکی کے نام بنک میں جمع کرا سکیں۔

نانا جان کو اس جواب سے بڑی مایوسی ہوئی۔ ہر چند اُن کا شمار شہر کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا تھا، لیکن وہ اپنی ساری جائداد بھی بیچ دیتے تب بھی پانچ لاکھ روپے جمع نہیں کر سکتے تھے اور بالفرض روپے کا انتظام ہو بھی جاتا، تو سرفراز کے گریجویٹ ہونے کی شرط بڑی ٹیڑھی تھی، کیونکہ وہ تو انٹرنس بھی پاس نہیں کر پائے تھے۔ بس ایک ہی شرط تھی جس پر وہ پورے اترتے تھے۔ وہ یہ کہ شکل و صورت کے بڑے اچھے تھے۔

بلکہ کہنا چاہیئے کہ حسین تھے چنانچہ نواب ظہیر الدولہ کے جواب پر عام طور پر یہی تصور کیا گیا، کہ چونکہ وہ بڑے حلیم الطبع اور نیک دل ھیں، اس لئے انہوں نے صاف انکار کر کے اپنے ایک معزز ہم وطن کو ناراض کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور جان بوجھ کر ایسی شرطیں لگادی ہیں جن کا پورا کرنا سرفراز ماموں اور ان کے متعلقین کے لئے ممکن نہ ہو۔

نانا جان نے اپنے دونوں بڑے بیٹوں کی موجودگی میں سرفراز ماموں کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ ماموں چپکے بیٹھے ان کی باتیں سنتے رہے۔ جب ان کے گریجویٹ نہ ہونے کا ذکر آیا۔ تو وہ فوراً بول اٹھے۔

"یہ کیا مشکل بات ہے۔ یہ شرط تو میں آسانی سے پوری کر سکتا ہوں۔"

اس پر ان کے دونوں بڑے بھائی کہنے لگے "اگر تم اسے پورا کرو تو روپیہ ہم کسی نہ کسی طرح مہیا کر ہی لیں گے خواہ ہمیں اپنے حصہ کی جائداد بیچنی ہی کیوں نہ پڑے۔"

اس کے بعد کسی نے کوئی لفظ نہ کہا۔

اس شام گھر والوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ سرفراز ماموں کتابوں کی ایک گٹھڑی اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ انہوں نے کسی سے بات نہ کی۔ سیدھے اپنے کمرے میں پہنچے اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اور یوں انہوں نے اکیلے ہی بغیر کسی کی مدد کے پڑھائی شروع کردی۔ وہ کھانا کھانے کے لئے بھی باہر نہ آتے۔ بلکہ کھانا کمرے کے اندر ہی منگوا لیا کرتے۔ ان کے تمام عزیزوں کو سخت تعجب تھا کہ جو شخص عمر بھر ایسا آرام طلب اور سست رہا ہو اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی کہ وہ دن رات مشین کی طرح کام کرنے لگے۔

جب ایک ہفتہ گذر گیا، تو انہوں نے اپنی والدہ سے کہا۔

"نواب ظہیر الدولہ کو کہلوا دیا جائے کہ ان کی شرطیں منظور کر لی گئی ہیں۔ مگر انہیں کچھ مہلت دینی ہوگی۔"

اتفاق سے آئندہ میٹرک کے امتحان میں صرف تین ہی مہینے باقی تھے۔ انہوں نے پرائیویٹ طور پر امتحان دیا۔ اور اچھے نمبروں سے پاس ہوگئے۔ اگلے سال انہوں نے فارسی کا ایک اعلیٰ امتحان اور ایف اے انگریزی کا امتحان دیا۔ اور ان میں بھی اعزاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی اب اگلا امتحان صرف بی۔ اے۔ انگریزی کا رہ گیا تھا۔

جب نواب ظہیر الدولہ کو اس کی اطلاع پہنچی تو وہ بڑے متعجب ہوئے۔ اُدھر ان کی صاحبزادی بھی یہ سن کر پھولی نہ سمائیں کہ کوئی شخص ان کی خاطر اتنی سختی جھیل رہا ہے۔ انہیں اپنی بعض بے تکلف سہیلیوں کے ذریعہ سرفراز ماموں کی خوش جمالی اور خوش طبعی کا حال معلوم ہو گیا تھا، اور وہ بے دیکھے ہی ان پر ریجھ گئی تھیں۔ اس پر لڑکی کی والدہ نے نواب صاحب سے کہا، کہ لڑکا بہت نیک اطوار ہے۔ خواہ مخواہ کی شرطیں لگا کر شادی میں کیوں دیر کی جا رہی ہے۔ ممکن ہے ایسا داماد پھر ہاتھ نہ آئے۔ نواب صاحب نے کچھ دیر تامل کیا۔ اور پھر نیم رضامند ہوگئے۔ لیکن جب ان کا یہ منشا کسی ذریعہ سے نانا جان تک پہنچایا گیا تو سرفراز ماموں نے یہ کہہ کر نامنظور کر دیا کہ جو شرطیں لگائی گئی ہیں۔ ان کی پوری پوری پابندی کی جائے گی۔

اس کے بعد جو سال گذرا۔ اس کے دوران میں سرفراز ماموں نے بی۔ اے پاس کر لیا۔ اور اُدھر ان کے والد اور بھائیوں نے حق مہر کے روپے کا انتظام بھی کر لیا۔ شادی کی تاریخ مقرر کی گئی۔ دونوں طرف زور شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔ اور دونوں خاندان خوش خوش اس روزِ سعید کا انتظار کرنے لگے۔

آخر کار وہ دن آ ہی پہنچا۔ سرفراز ماموں سیاہ بانات کی شیروانی پہنے سر پر سنہری پگڑی باندھے اصیل گھوڑے پر سوار، براتیوں کے ہمراہ دُلہن کے گھر روانہ ہوئے۔ یہ قصہ سارے شہر میں مشہور ہو چکا تھا، لوگ دولھا کو دیکھنے کے اشتیاق میں بازاروں کے دونوں

طرف یوں قطار باندھے کھڑے تھے جیسے کسی مشہور لیڈر کا جلوس گزرنے والا ہو۔

اس برات کی کیفیت اب تک میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ کیونکہ میں بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ بڑھیا کپڑے پہنے اسمیں شامل تھا اس وقت میری عمر دس برس کی ہوگی۔

جب ہم نواب صاحب کی محل سرا کے سامنے پہنچے۔ تو خود نواب صاحب نانا جان اور سرفراز ماموں کی پذیرائی کیلئے دروازے پر موجود تھے محل سرا کے اندر ایک وسیع دالان کے سامنے قیمتی شامیانوں کے نیچے دولہا کے بیٹھنے کے لئے مسند بنائی گئی تھی۔ جو بیش قیمت ایرانی قالینوں اور زربفت کے گاؤ تکیوں سے آراستہ تھی۔ سرفراز ماموں اپنے والد اور بھائیوں کے ساتھ اس پر بٹھا دیئے گئے۔ ہر چند ان کا چہرہ پھولوں اور سونے کے تاروں سے گندھے ہوئے سہرے سے چھپا ہوا تھا، اور کوئی شخص ان کی دلی کیفیت کو بھانپ نہیں سکتا تھا۔ لیکن میں نے ان کے قریب پہنچ کر کسی نہ کسی طرح ان کے چہرے کی ایک جھلک دیکھ ہی لی۔ اچانک ایک نامعلوم خوف سے میرا دل دھڑک اٹھا۔ سرفراز ماموں خوش نہیں تھے۔ وہ بڑے فکرمند معلوم ہوتے تھے۔

جب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے، تو وہ مولوی صاحب جنہیں نکاح خوانی کی رسم ادا کرنی تھی سبز جزدان میں لپٹا ہوا قرآن مجید بغل میں دبائے نمودار ہوئے۔ اور سرفراز ماموں کے قریب پہنچے اس وقت میرے دل نے نہ معلوم کیوں اور بھی زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔

چند لمحے بڑے اضطراب میں گزرے اس کے بعد میں نے دیکھا کہ سرفراز ماموں نے اپنے منجھلے بھائی کے کان میں جو ان کے قریب ہی بیٹھے تھے کچھ کہا اور پھر ایک دم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے منجھلے بھائی نے نواب صاحب کے ایک کارندے سے کہا کہ یہ ذرا غسل خانہ جانا چاہتے ہیں۔

سرفراز ماموں اس شخص کی رہنمائی میں منجھلے بھائی کے ہمراہ غسل خانے تک پہنچے وہ وہاں بمشکل ایک منٹ ٹھہر کر باہر نکل آئے۔ غسل خانہ ذرا فاصلے پر تھا۔ واپسی پر وہ اپنے دونوں ہمراہیوں سے ذرا آگے چلنے لگے۔ اچانک ان کی نظر محل سرا کے پھاٹک پر پڑی اور انہوں نے بجائے شامیانے کی طرف جانے کے پھاٹک کا رُخ کیا۔ اور بیشتر اس کے کہ کوئی ان کے ارادے کو بھانپ سکے، وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے پھاٹک کے باہر نکل آئے۔ سڑک پر پہنچ کر انہوں نے سہرے کو تو ایک طرف پھینکا، اور زری کی سلیم شاہی جوتی جو خاص طور پر اس موقع کے لئے بنوائی گئی تھی ہاتھ میں پکڑے بے تحاشا ایک طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ پھاٹک پر جو لوگ کھڑے تھے، کچھ دیر تک وہ سکتے کے عالم میں رہے، پھر اچانک وہ بھی سرفراز ماموں کے تعاقب میں بھاگنے لگے۔ مگر اتنی ہی دیر میں وہ کہیں سے کہیں پہنچ چکے تھے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ اپنی اس تحقیر پر نواب ظہیر الدولہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اِدھر ہمارے نانا جان مارے شرم کے گڑے جاتے تھے۔ ان کی سمجھ میں اور تو کچھ نہ آیا۔ بے اختیار نواب صاحب کے قدموں میں گر پڑے۔ اور کہا۔ "حضور معاف کر دیں۔ ضرور یہ نالائق دیوانہ ہو گیا ہے۔ میں ابھی اسے عاق کرتا ہوں۔ میرے جیتے جی وہ کبھی میرے گھر میں قدم نہ رکھ سکے گا!"

مگر نواب صاحب کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ بولے "مہربانی کر کے فوراً میرے گھر سے دفان ہو جیئے" یہ کہا اور مٹھیاں بھینچتے ہوئے محل سرا کے اندر چلے گئے۔

ہم بہت بے عزت ہو کر وہاں سے نکلے۔ راستے بھر کسی نے کسی سے بات نہ کی جب گھر پہنچے تو عورتوں نے رو رو کر

کہرام مچا دیا۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ نواب صاحب کے ہاں اس سے بھی کہیں بڑا کہرام مچا تھا۔ دلہن غش کھا کر گر پڑی۔ اور تین دن اور تین رات تک اسے ہوش نہ آیا۔ اس کے والدین اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ اس کی جان تو بچ گئی۔ مگر اسے پورے طور پر صحت یاب ہونے میں چھ مہینے لگ گئے۔

سرفراز ماموں کے متعلق کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے ساتھ کیا پیش آیا۔ وہ کہاں غائب ہو گئے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انہوں نے خودکشی کرلی ہے، بعض کہتے کہ وہ کسی دور دراز ملک کو بھاگ گئے ہیں۔ مگر وثوق سے کوئی کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

پانچ برس تک ان کی کوئی خبر نہ آئی۔ اور پھر ایک صبح، اچانک وہ اپنے والد کے ہاں آدھمکے۔ جیسی کہ کہاوت ہے کہ وقت زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔ یہی معاملہ ان کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ان کو زندہ سلامت دیکھ کر نانا جان اور تمام عزیزوں کا دل باغ باغ ہو گیا۔ عورتوں نے ان کی بلائیں لیں، اور خوب ڈھولک پر گا بجا کر اپنی خوشی ظاہر کی۔

اُدھر اسی اثنا میں نواب صاحب کی بیٹی کی شادی ایک نواب زادے سے ہو چکی تھی اور وہ دو لڑکوں کی ماں بھی بن چکی تھیں۔ چونکہ نواب زادہ خوبصورت بھی تھا اور نوجوان بھی۔ اور نجابت اور امارت میں بھی وہ اپنے سسر سے کچھ بڑھ کر ہی تھا۔ اس لئے سرفراز ماموں کے ساتھ اس کے رشتہ کا نہ ہونا نیک فال ہی تصور کیا گیا۔ اور اس واقعہ کو جلد ہی بھلا دیا گیا۔

سرفراز ماموں نے یہ راز کسی کو نہیں بتایا کہ وہ اپنی شادی کے روز بھاگ کیوں گئے تھے، اور وہ کہاں گئے اور کہاں رہے۔ اور روپے پیسے کے بغیر انہوں نے کیسے گزر کی۔ جب ان سے زور دے کر پوچھا جاتا تو ان کی آنکھوں میں ایک پُراسرار مسکراہٹ جس میں شرارت کا خفیف سا عنصر چھپا ہوا ہوتا، چھلکنے لگتی۔ یہی مسکراہٹ رفتہ رفتہ ان کے کردار کا ایک جزو بن گئی تھی۔

میں نے اس مسئلے پر بہت غور کیا۔ لیکن میں ان کے فرار کی اصل وجہ سمجھ نہ سکا۔ ممکن ہے کہ اس میں ان کی طبعی بزدلی کو دخل ہو۔ یعنی وہ بیوی بچوں کا بوجھ اٹھانے سے ڈرتے تھے۔ یا ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ وہ اپنے والد، اپنے بھائیوں اور ان کے بچوں سے ان کی جائداد چھین کر، خواہ وہ ان کی رضامندی سے کیوں نہ ہو۔ انہیں مفلس و قلاش بنانا نہیں چاہتے تھے...

اور اب چونکہ وہ کوئی دم کے مہمان تھے۔ بلاشبہ یہ بات ہمیشہ کے لئے ایک راز ہی بنی رہے گی۔

ضمیر الدین احمد — سوغات (کراچی)

پہلی موت

گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے رُک کر اپنے سانس کو قابو میں کیا۔ وہ بھاگا تو نہیں تھا مگر تیز تیز ضرور چلا تھا کیونکہ اس کا سانس قدرے پھولا ہوا تھا۔ پھر اس نے گلی پر ایک نظر ڈالی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے سیڑھیاں چڑھ کر دروازے سے کان لگایا۔ اندر بھی سناٹا تھا جس کے معنی یہ تھے کہ صحن میں اور اس کے بعد جو برآمدہ تھا اس میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ مگر جو پاخانہ صحن سے ملحق تھا اس میں ضرور کوئی تھا کیونکہ پاخانے کی موری میں سے بہہ بہہ کر پانی اس نالی میں گر رہا تھا جو گلی کے بیچوں بیچ بہتی تھی۔

اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ بڑے سے دروازے کے سامنے جو بڑا سا نیم کا پیڑ لگا ہوا تھا اس کے پتوں میں کوئی پرندہ پھڑپھڑا کر ساکت ہو گیا۔ پھر پاخانے کے دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز آئی اور وہ تیزی سے کھلے ہوئے دروازے کے ایک پٹ کی آڑ میں ہو گیا۔

اس نے دروازے کی دراز میں سے جھانکا تو اسے اس کا بڑا بھائی ایک ہاتھ سے استنجے کا لوٹا پکڑے اور دوسرے سے ازار بند اڑستے ہوئے برآمدے کی طرف جاتا نظر آیا مگر فوراً ہی بظاہر بلا وجہ بھائی نے رک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحہ توقف کیا اور پھر اپنا رخ دروازے کی طرف موڑ دیا۔

"سلام علیکم۔"

بھائی نے گلی میں سے گزرتے ہوئے کسی شناسا کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!"

موٹے چاچا ہیں، اس نے دروازے کے پیچھے سے اندازہ لگایا۔ انہیں پتہ چلے گا تو کتنے خوش ہوں گے۔ ہمیشہ کہتے ہیں کہ

"دروازے کے پیچھے کیوں چھپا کھڑا ہے؟"

بھائی کی آواز نے اس کے ذہن کو موٹے چاچا کی نصیحت سے ہٹا کر اس سوال کے حل کی تلاش میں لگا دیا کہ انہیں کیسے پتہ چلا کہ میں اس دروازے کے پیچھے چھپا کھڑا ہوں اس نے ادھر اُدھر دیکھا دروازے کی اوٹ مکمل تھی۔ پھر اس نے نیچے کی طرف دیکھا۔ لڑکی کے تختوں کا وہ پردہ جس کے پیچھے وہ چھپا تھا زمین تک نہیں آتا تھا اور اس لئے اس کے کرمچ کے جوتے باہر سے صاف نظر آ رہے ہوں گے۔

"ہم آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔" اس نے پردہ ہٹا کر باہر آتے ہوئے کہا۔

"آنکھ مچولی کھیل رہا ہے!" بھائی نے اس کے چہرے پر ایک شک بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"اور نہیں تو کیا!"

"چہرہ دیکھ جا کر شیشے میں۔ پیلا پڑا ہوا ہے۔ جیسے دم نکلا جا رہا ہو ڈر کے مارے۔"

"کس کا؟ میرا؟"

"اور نہیں تو کیا میرا!"

"میرا کیوں نکلنے لگا دم؟" اس نے سینہ پھلا کر کہا۔ "میں نے چوری کی ہے کسی کی۔ میں تو کھیل رہا ہوں۔" یہ کہتے کہتے واقعی اس کے چہرے پر گھبراہٹ کی جگہ خود اعتمادی نے لے لی۔

مگر پھر بھی اس کے بھائی نے کہا۔ "تو نے ضرور کوئی حرکت کی ہے۔ چل اماں پاس۔" اور اس ہاتھ سے جس سے وہ استنجے کا لوٹا نہیں پکڑے تھا بھائی نے اس کے دائیں ہاتھ کی آستین پکڑ لی۔

"جاؤ۔ نہیں جاتا۔" اس نے جھٹکا دے کر آستین چھڑا لی۔

"اچھا۔ ٹھیر۔ ابھی کہتا ہوں اماں سے۔"

"ہاں۔ کہہ دو۔"

وہ اور اکڑ گیا اور اس کا بھائی استنجے کے لوٹے میں بچے ہوئے پانی سے مٹی کے فرش پر لہریں بناتا ہوا برآمدہ پار کر کے ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔

"دیکھو اماں ....!"

اتی دور جا کر چلایا۔ واں۔ ڈیوڑھی کے اس سرے پر۔ زیادہ تر تو یہیں سے چلاتا ہے۔ گھر میں گھستے ہی۔ اور پھر ڈانٹ پڑتی ہے۔ مت گلا پھاڑا کر۔ پاس آکر نہیں کہہ سکتا جو کچھ کہنا ہوتا ہے۔ کیسی شکل ہو جاتی ہے اس کی جب اماں ڈانٹ پلاتی ہیں۔ اور اس وقت کہہ رہا تھا اماں سے کہہ دونگا۔ کہہ دو۔ ہنہ! میں کوئی ڈرتا ہوں اماں سے۔ آں! میں کسی سے بھی نہیں ڈرتا۔ ابا سے بھی نہیں۔

گلی کے اس موڑ سے جو قبرستان کی طرف تھا ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور نیم کے سایہ دار درخت کے نیچے پڑے ہوئے جھلنگے کی پٹی پر بیٹھ کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔ آوازیں آہستہ آہستہ قریب آتی گئیں اور بلند ہوتی گئیں اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جو غول وہ قبرستان میں چھوڑ آیا تھا وہ آوازوں کا طوفان بن کر اس کے سر پر پھٹنے والا ہے۔

پھٹا کرے۔ میں کوئی ڈرتا ہوں۔ میں نے کوئی بری بات تھوڑی کی ہے۔ اور نہیں تو کیا۔ کون اس بچارے کو۔

دروازے کے سامنے بدمست ہاتھی جھوم کر ساکت ہو گیا۔ اور پھر سناٹے کو چیرتی ہوئی آواز آئی۔

"بابو جی!"

جیسے کوئی فریاد کر رہا ہو۔

"بابو جی!"

نڈھال۔ مری ہوئی آواز۔

"نہیں ہیں بابو جی!"

"بابو جی!"

بابو جی! بابو جی! اس وقت نہیں یاد آئے تھے بابو جی۔ اب آیا ہے شکایت کرنے۔ بابو جی کا بچہ!

"کیڈیا نہیں ہیں بابوجی۔"

"در دجاتو کھولو۔"

یہ بادشاہ ہے۔ اسے بادشاکیوں کہتے ہیں؟ قبریں کھودتا ہے۔ بھیک مانگتا ہے۔ براتوں میں جھنجھم جھنجھم باجا بجاتا ہے۔ بادشا۔ نام تو شاید امیرا ہے!۔

"بھاگ جاؤ۔ نہیں کھولتے۔"

"کنڈی کھٹکھٹاؤ جی۔" کسی نے رائے دی اور لوہے کی موٹی کنڈی دروازے پہ بجنے لگی وہ جھلنگے پر سے اٹھا اور جھپٹ کر دروازے کے پاس گیا۔

"جاتے ہو کہ نہیں۔"

"ہم تو بابوجی کے پاس آئے ہیں۔"

کنڈی زور سے بجنے لگی۔ اور کھٹ کھٹ کے شور کے ساتھ کئی اور آوازیں گڈمڈ ہو گئیں۔ کوئی ہنس رہا تھا۔ شاید وہ سارے لونڈے لپاڑے جن کے ساتھ وہ تھوڑی دیر پہلے کھیل رہا تھا۔ جلوس بنا کر تماشہ دیکھنے ساتھ آئے تھے۔ کچھ لوگ اونچی آواز سے باتیں کر رہے تھے۔

پھر شور ایک دم گھٹ گیا۔ اور ایک ساتھ کئی آوازیں آئیں "بندگی لالہ جی۔"

"ہرے رام۔ ہرے رام۔ کا بھیو اسے؟"

مگر قبل اس کے کہ وہ لالہ جی کے سوال کا جواب سن سکے اس کے کانوں میں اس کی ماں کی آواز آئی۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے زیر لب کہا اور دروازے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں پوچھ رہی ہوں کیا بات ہے؟" ماں نے برآمدہ عبور کرتے ہوئے سوال دھرایا "یہ شور کیسا ہے؟ بہرا ہو گیا ہے کیا!"

جواب میں وہ جوتے سے پکی ٹھکولیوں کو کچلنے لگا۔

"میں کہہ رہا تھا یہ ضرور کچھ کر کے آیا ہے!" اس کے بڑے بھائی نے اس کی ماں کے بعد برآمدہ عبور کر کے صحن میں آتے ہوئے کہا۔

"پھوٹتا کیوں نہیں!" ماں نے بالکل اس کے سامنے آ کر کہا۔

وہ اب بھی چپ رہا۔ مگر ماں کی آواز شاید باہر تک پہنچ گئی تھی کیونکہ اب کنڈی بجنا بند ہو گئی تھی۔ اور کئی حلق بیک وقت "بی بی جی۔ بی بی جی" کا نعرہ لگا رہے تھے۔

"کیا بات ہے؟" ماں نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے باہر والوں سے پوچھا۔

"میاں نے سر پھوڑ دیا۔"

"ہائیں! کس کا؟"

"غفتوا کا۔"

ماں نے اس کی طرف ایسے دیکھا گویا انہیں باہر والوں کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔ پھر انہوں نے دروازے کی درز میں سے باہر جھانکا۔ اور ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

"سچ تو کہتا ہے۔" انہوں نے آہستہ سے کہا، "لہولہان ہو رہا ہے۔"

بھائی نے جو ماں کے پاس ہی کھڑا تھا ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھول دی اور ماں نے اس سے کہا۔

"ان سے پوچھو ہوا کیا تھا۔"

بھائی دروازے کا ایک پٹ کھول کر چوکھٹ پر آگیا۔ سامنے عنتو کھڑا ہوا تھا۔ اس کے سر کے دائیں حصے سے خون ٹپک رہا تھا۔ خون کے دھبے اس کے کالے کرتے اور چوخانے کی لال تہمد پر نظر آ رہے تھے۔ دو آدمی اسے سہارا دیئے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے اور ادھر ادھر وہ لونڈے لپاڑے تھے جنکے ساتھ وہ تھوڑی دیر پہلے کھیل رہا تھا۔ ان میں سے کچھ ہمہ تن توجہ تھے۔ کچھ ہنس رہے تھے۔ کچھ کھسر پھسر کر رہے تھے۔ کچھ سنجیدہ تھے مگر ان کے چہروں پر عنتو سے ہمدردی کے آثار نہیں تھے۔

"اس سے کہو بیٹھ جائے۔" ماں نے دروازے کی آڑ سے اس کے بھائی سے کہا۔

عنتو سیڑھیوں پر بیٹھ گیا تو بھائی نے پوچھا "ہوا کیا تھا؟"

"میں بتاؤں۔" ایک لونڈے نے جھٹ سے پیش کش کی۔

"چپ رہ بے" ان دو آدمیوں میں سے ایک نے جو عنتو کو سہارا دیئے ہوئے تھے اسے ڈانٹ دیا۔

یہ وہی مردود بادشاہ ہے۔ اس نے ایک اور نمکولی کچلتے ہوئے سوچا۔

"ہوا کیا بھیا۔ میاں قبرستان میں کھیل رہے تھے۔ اتنا بڑا گُما اٹھا کر مار دیا عنتو اسکے۔ سر پھٹ گیا۔"

جھوٹا کہیں کا! یہ نہیں بتاتا کہ پہلے کیا ہوا تھا۔ اور یہ بلا دا کا بچہ تو وہاں تھا بھی نہیں اس وقت

"نہیں پہلے عنتوا نے مارا تھا۔" ایک اور لونڈا بولا۔ اور ماں اور بھائی کا چہرہ لال ہو چلا۔

"اس نے مارا میرے لڑکے کو۔ اس فقیرنے!" ماں دروازے کی اوٹ میں تملائی۔

"جھوٹ بولتا ہے حرامی۔ بی بی جی۔" عنتوا نے لونڈے کو غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے چھوا بھی ہو میاں کو تو جو چور کی سجا سو میری۔"

"اور اس نے مدن کو جو مارا تھا۔" ایک اور لونڈے نے ہانک لگائی۔

"ہاں مارا تھا اس نے۔" وہ کئی نمکولیاں ایک ساتھ کچلتا ہوا ماں کی طرف بڑھا۔ "مدن کو۔ جوتوں سے۔ وہ بچارا چلا رہا تھا اور یہ لئے مارے جا رہا تھا۔ جوتے سے۔ اور یہ اسے گھسیٹ بھی رہا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے اور یہ پھر بھی مارتا رہا اسے۔ اتنے بڑے آدمی کو۔ سب کے سامنے۔ سڑک پر۔"

"تجھے تو نہیں مارا؟" ماں نے پوچھا۔

"نہیں۔ مگر مدن کو جو مارا۔ جوتوں سے۔ وہ بچارا چلا رہا تھا اور یہ اسے اتنے اتنے بڑے کنکروں پر گھسیٹ رہا تھا۔ اس کے سارے کپڑے پھٹ گئے۔ اور کئی جگہ خون بھی نکلا۔"

"میاں ٹھیک کہتے ہیں۔" کئی لونڈوں نے ایک ساتھ نعرہ بلند کیا۔

"پر بی بی جی اس سالے۔"

"اس سے کہو یہاں گالی نہ بکے۔" ماں نے بھائی سے کہا۔

"کہہ رہی ہیں یہاں گالی نہ بکو۔"

"غلطی ہو گئی بی بی جی۔ میں کہہ رہا تھا مدن پہ میرے دس روپے جاتے ہیں اور وہ حرامی دینے کا نام نہیں لیتا۔ آج ہتھے چڑھ گیا۔"

میں نے تقاضا کیا تو ٹال مٹول کرنے لگا۔"

"میں نے خود سنا۔ وہ کہہ رہا تھا بقرعید کے چاند میں ضرور دے دوں گا" اس نے ماں کو مخاطب کر کے کہا۔

"مگر تجھے ان کے جھگڑے میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ تیرا سگا لگتا ہے مدن!" ماں نے اُسے ڈانٹ پلائی۔

یہ سمجھتی کیوں نہیں۔ کے جو راہوں کے یہ مردود عنتوا اسے مار رہا تھا اور وہ بھی دس روپوں کے لئے۔ دس روپے کیا ہوتے ہیں منگی مسلمانی میں بیس روپوں کے لڈو باٹے تھے۔ خود کہہ رہی تھیں۔ میں اتنا بڑا ہوتا تو گما تھوڑی مارتا۔ خود ڈھکائی کرتا اس عنتوا کے بچے کی اور مدن کو بچا لیتا۔ اسے کسی نے بچایا بھی نہیں۔ اتنے سارے لوگ تھے۔

"ہاں بی بی جی۔ بھلا میاں کو اس حرامی سے کیا مطلب" عنتوا نے کہا۔ "اپنے دس روپے بھی گئے اور سر پھٹا اوپر سے۔"

"سیروں خون بہہ گیا ہوگا" بلاوا نے کہا۔

"اور نہیں تو کیا" بادشاہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"سیروں خون نکل گیا ہوتا تو یہاں نظر نہ آتے" اس کے بھائی نے چڑ کر کہا۔

چھوٹا کہیں کا!

"خیر سیروں نکلا یا چھٹانک دو چھٹانک نکلا ضرور۔ مگر جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ اب ہم کیا کر سکتے ہیں سوائے" ماں نے ایک قہر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "اس کی خبر لینے کے۔"

وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"پر بی بی جی۔ اس کا کیا بنے گا" بادشاہ نے عنتوا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو اپنے اوپر غشی طاری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ تو گیا کام سے نہ جانے کتنے دن کے لئے۔ قبر کھودنا تو الگ اس سے پھوڑا تک نہ اٹھے گا۔"

"اور دوا دارو پر جو خرچ ہوگا وہ کہاں سے آئے گا!" بلاوا نے بات آگے بڑھائی۔ ماں کی نظروں میں اور قہر بھر گیا۔ انہوں نے نیفے کو ٹٹول ٹٹول کر چاندی کا ایک روپیہ برآمد کیا اور اسے بھائی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "دیدو اسے۔"

بھائی نے روپیہ عنتوا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"اس سے کیا بنے گا بی بی جی" عنتوا منمنایا۔

"اس سے جیادہ تو مرہم پٹی پر خرچ ہو جائے گا" بلاوا بولا۔ "اور داگدر صاحب دودھ پینے کو ضرور بتلائیں گے" بادشاہ نے کہا۔

ماں سوچنے لگیں کہ اگر وہ پانچ روپے جو منے کے ابا نے آج ہی صبح خالص گھی کے لئے دیئے تھے اس فقیر کو دیدیں تو گھی کہاں سے آئے گا۔ اور گھی نہیں ہوگا تو ان کی دال کیسے بگھرے گی۔ اور دال نہیں بگھرے گی تو انہیں ضرور پتہ چل جائے گا کہ روپے کہاں گئے۔

بھائی ماں کے تردد کو سمجھ گیا "جاؤ اور نہیں ملے گا۔ ایک روپیہ بہت ہوتا ہے۔"

اس بار بادشاہ اور بلاوا دونوں ایک ساتھ بولے "یہ تو جلم ہوگا۔ سراسر جلم۔ بے چارے کا سر پھوڑ دیا اور صرف ایک روپیہ دیتے ہو"

عنتوا کراہا۔

ماں نے بھائی کو ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ اور دروازے کے پٹ کو مخاطب کر کے بولیں "اس وقت اور پیسے نہیں ہیں۔ پھر لے لینا۔"

"پر جرورت تو ابھی ہے بی بی جی۔ دوا دارو کے لئے۔ پھر کیا ہوگا۔"

ماں پھر سوچ میں پڑ گئیں اور اس نتیجے پر پہنچیں کہ یہ لوگ ایک روپے پر قناعت کرنے والے نہیں۔ وقت کم ہے منے کے ابا کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ ان بلاؤں کو اس وقت کسی نہ کسی طرح ٹالنا ہی پڑے گا۔

انہوں نے ہاتھ کے اشارہ سے بھائی کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا کہ نقشی پاندان میں کتھے کی کلھیا کے نیچے ایک پانچ روپے کا نوٹ رکھا ہے۔ وہ نکال لاؤ۔

بھائی نے عنتوا کے ہاتھ پر جب پانچ روپے کا نوٹ رکھا تو تینوں فقیروں نے ایک بار پھر احتجاج کیا کہ پانچ روپے تو بہت کم ہوتے ہیں کم از کم دس تو ہونے چاہئیے۔ مگر اس بار ان کا احتجاج کمزور تھا اور ماں اور بھائی کی بس زور دار اس لئے معاملہ ہو گیا۔ اور آگے آگے تینوں فقیر اور اس کے پیچھے لونڈے لپاڑے ایک جلوس کی شکل میں روانہ ہو گئے۔

"ٹھیر تو چلا کدھر"

وہ بھاگنے یا فرار ہونے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ ہوا یہ کہ جب بھائی نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی تھی تو اسکی نظریں نہ جانے کیوں برآمدے کی طرف اٹھ گئیں تھیں جہاں اسے تخت پر نانی بیٹھی نظر آئی تھیں۔ نانی کے پاس گھس کر بیٹھنا اسے ہمیشہ سے پسند تھا خاص کر ایسے موقعوں پر جب ڈانٹ ڈپٹ یا مار پٹائی کا خطرہ ہوتا۔ حالانکہ یہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسے موقعوں پر وہ اس کی زیادہ مدد کرنے سے قاصر رہتی تھیں کیونکہ اماں اور ابا دونوں کی۔ خاص کر ابا کی تاکید تھی کہ اس قسم کے ناجائز لاڈ پیار سے لڑکے کو خراب نہ کیا جائے۔ اور نانی بچاری کا کوئی بھی نہیں۔ تبھی تو ڈرتی ہیں اپنے سے۔ تو اس کے قدم آپ ہی آپ برآمدے کی طرف اٹھ گئے تھے جہاں نانی تخت پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بھاگنے یا فرار ہونے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

وہ رک گیا اور کنکھیوں سے ان ٹانگوں کو دیکھنے لگا جو مارکین کے تنگ پاجامے میں لپٹی ہوئی تھیں اور شکستہ سلیپروں میں پڑے ہوئے پیروں کی مدد سے سپٹر سپٹر اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"اب بتا!" ماں نے اس کے ایک کان کو اینٹھتے ہوئے کہا۔ کیوں چھوٹا تو نے اس کا سر!"

"کے جو دیا!" اس نے جلتے ہوئے کان کو چھڑانے کی کوشش کئے بغیر کہا۔

"کیا کہدیا!" بھائی نے کہا جو آ کر بالکل اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

"بول۔ کیا کہدیا!" ماں نے کان کی گرمی کے لوچ سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈانٹا۔

ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ پھر بتانے سے فائدہ۔

لیکن پھر بھی اس نے اتنا تو کہہ ہی دیا "وہ مدن کو جو مار رہا تھا۔ جوتوں سے۔ اور۔"

"پھر وہی بکواس۔" ماں نے کان چھوڑ کر تھپڑ تانتے ہوئے کہا: "تیرا کونسا سگا لگتا ہے وہ مدن کا بچہ!"

"ان لونڈوں کے ساتھ کھیل کے اس کی عادتیں خراب ہو گئی ہیں۔" بھائی بولا۔

یہ بلا وجہ بولے جا رہے ہیں بیچ میں۔ بڑے آئے کہیں کے۔

"تجھے دفعہ منع کیا مت کھیلا کر ان دھنے جلاہوں کے لونڈوں کے ساتھ مگر اس کو چین نہیں پڑتا بغیر ان کے چوتڑوں میں گھسے کمبخت کہیں کا!"

اور ساتھ ہی چٹاخ سے ایک تھپڑ پڑا جس نے ان کی آنکھوں کے سامنے تارے بکھیر دیئے۔ سارے بدن کا خون کھچ کر اس کے چہرے میں جمع ہو گیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے رخساروں میں شعلے لپک رہے ہیں اس کی آنکھیں بھیگ چلیں مگر وہ رویا نہیں۔

"اور جب دیکھو قبرستان میں۔ ابھی سے یہ اطوار ہیں تو بڑا ہو کر نہ جانے کیا قیامتیں ڈھائے گا۔"

ایک اور تھپڑ۔ پڑا مگر اس بار اس کا دماغ بھنایا نہیں اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ جو خون اس کے چہرے پر جمع ہو گیا تھا تیزی سے بدن کے دوسرے حصوں میں واپس جا رہا ہے۔ اس کا بدن تننے لگا اور جب اس نے تیسرے تھپڑ کو روکنے کے لئے سر اٹھا کر اور سینہ تان کر اپنا بایاں ہاتھ اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں کا اٹھا ہوا ہاتھ تھا مگر اس کے ذہن کے سامنے ایک تصویر تھی جس میں پورا ایک آدمی۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس۔ سپید کنکروں کی سڑک پر کھینچا جا رہا تھا۔ وہ بار بار کبھی دایاں اور کبھی بایاں ہاتھ اوپر اٹھا رہا تھا تاکہ اپنے چہرے اور سر کو اس جوتے کی زد سے بچا سکے جو پے در پے اس کے اوپر برس رہا تھا۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹا تو ماں نے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا "جاتا کہاں ہے۔ بول پھر کرے گا ایسی حرکت!"

اس نے جھٹکا دے کر اپنا بازو چھڑا لیا اور اس کے منہ سے نکلا "ہاں" جسے سن کر اس کے کان اور اس کا ذہن بھونچکے رہ گئے۔

"تیری یہ مجال!"

ماں اس کی طرف لپکیں تو وہ برآمدے کی طرف بھاگا۔ اور جب ماں نے دیکھا کہ وہ اس کی زد سے باہر ہو چکا ہے تو دائیں پیر کی سلیپر اتار کر اس کا نشانہ بنایا۔ وہ برآمدے میں داخل ہو رہا تھا جب سلیپر اس کے سر پر پڑی اور وہ جیسے جم کر رہ گیا۔ جو کام دو سخت تھپڑ نہ کر پائے تھے وہ سلیپر نے کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ رونے لگا حالانکہ سلیپر پھسلتی ہوئی پڑی تھی۔

"بہت ہو گیا بیٹی" نانی نے تسبیح رکھتے ہوئے کہا "جوتے سے کسی کو نہیں مارتے۔ کتابوں میں لکھا ہے۔"

"اس کی حرکتیں نہیں دیکھتیں۔ اس کا سر پھوڑ دیا اور کہتا ہے ہاں۔ کل کلاں کو کچھ اور کر بیٹھے گا۔ کوئی اس سے پوچھے تجھے کیا پڑی پرائے پھٹے میں پیر اڑانے کی۔"

میں تو اڑاؤں گا۔ میں تو اڑاؤں گا۔ میں تو اڑاؤں گا۔

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ مگر اس کا گریہ بے صدا تھا۔

"بالشت بھر کا ہے اور لمبے تڑنگے آدمیوں کے سر پھوڑتا پھرتا ہے۔ ابھی سے یہ حال ہے۔"

میں تو پھوڑوں گا، میں تو پھوڑوں گا، میں تو پھوڑوں گا۔

"چھ روپیوں پر پانی پھروا دیا منحوس نے۔ تم نے دو انہیں ایسی ٹھکائی کراؤں گی کہ پھر نام نہیں لے گا باہر جانے گا۔"

میں تو جاؤں گا، میں تو جاؤں گا، میں تو جاؤں گا۔

لیکن۔ ان کے "ذکر نے آنسوؤں کی رفتار میں کمی پیدا کر دی۔ اور وہ جا کر نانی کے پاس تخت پر بیٹھ گیا۔

"بیٹھ جا نانی کے کولھے سے لگ کر۔ لیکن یہ یاد رکھ کہ آج تجھے کھانا ہرگز نہیں ملے گا" ماں نے سلیپر میں پیر ڈالتے ہوئے کہا اور پھر وہ ڈیوڑھی میں سے ہوتی ہوئی بکتی جھینکتی اندر چلی گئیں اور بھائی باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کے باپ گھر میں داخل ہوئے۔ ترکی ٹوپی کا سیاہ پھندنا ہلاتے اور چھڑی گھماتے ہوئے حسب معمول وہ سیدھے اندر چلے گئے وہ نانی کے کولھے سے لگا ان کو کنکھیوں سے ایسے دیکھتا رہا گویا پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اس کے کان ان آوازوں پر لگ گئے جو مکان کے اندرونی حصہ میں ان کی موجودگی کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھیں۔ چپل جھاڑنے کی آواز۔ پیک تھوکنے کی آواز۔ منہ دھونے میں گلا صاف کرنے کی آواز۔ اور ماں سے باتیں کرنے کی آواز۔ پھر برتن کھٹکنے لگے اور وہ اندازہ لگانے لگا کہ اب اماں دیگچی میں سے لوکی کا بھرتا نکال کر تام چینی کی رکیبی میں رکھ رہی ہیں اور اب چولھے پر سے ماش کی گھی میں گھٹی ہوئی دال کی رکیبی اٹھا کر سینی میں رکھ رہی ہیں اور اب روٹی نکالنے کے لئے انہوں نے بھگونا کھولا ہے اور اب وہ سینی اٹھا کر اس چارپائی کی طرف چلی ہیں

جس پر بیٹھ کر ابا کھانا کھاتے ہیں۔

قبرستان کی طرف جانے سے پہلے اس نے باورچی خانے کا ایک چکر لگایا تھا اور ماں کو لوکی کا بھرتہ بناتے اور ماش کی دال گھوٹتے دیکھا تھا اسے یہ دونوں چیزیں بہت پسند تھیں۔ لوکی کا بھرتہ جس میں پٹنہ کی مرچوں کے بڑے بڑے ٹکڑے پڑے ہوتے تھے اور ماش کی اُجلی دال جسے خالص گھی میں خوب گھوٹا جاتا تھا۔ بھرتے اور دال کا خیال آتے ہی اسے بھوک لگ آئی مگر یہ سوچ کر ابھی اماں ابا کو کھانا کھلا رہی ہوں گی اس نے اپنی بھوک کا ذکر نانی سے نہیں کیا اور بھوک لگی کر ان آوازوں کا انتظار کرنے لگا جو اسے بتائیں گی کہ اب ابا کھانا کھا چکے۔

جب کلی کرنے اور دوبارہ برتن کھنکنے کی آواز آئی تو اس سے نہ رہا گیا اور وہ دبے قدموں ڈیوڑھی کی طرف چلا۔ نانی نے جو وظیفہ پڑھتے وقت منہ میں گھنگنیاں بھر لیا کرتی تھیں "ہوں" کی تو وہ لمحہ بھر کے لئے رُکا مگر اس کی سمجھ میں اس "ہوں" کا مطلب نہ آیا اور وہ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔

ڈیوڑھی کا دوسرا دروازہ اس دالان میں کھلتا تھا جس میں کئی پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ دالان سے ملحق باورچیخانہ تھا جو اس جگہ سے صاف نظر آرہا تھا جہاں وہ ڈیوڑھی میں کھڑا ہوا تھا اور دالان کے سامنے چوکور صحن تھا جو باہر والے صحن سے چھوٹا تھا۔ صحن کے بعد ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں باپ اور ماں منے کے ساتھ سویا کرتے تھے اور جس کا دروازہ اکثر بھڑا رہا کرتا تھا۔ دروازہ اس وقت بھی بھڑا ہوا تھا۔ صحن میں اسکا باپ بغیر کالر کی قمیص کے اندر ہاتھ ڈالے ٹہل ٹہل کر پیٹ سہلا رہے تھے اور اسکی ماں باورچیخانے میں کھٹر پٹر کر رہی تھیں۔

وہ آہستہ آہستہ دالان پار کر کے باورچی خانے میں گھس گیا اور ماں کے سامنے بت بنکر کھڑا ہو گیا۔

"کیوں آیا ہے یہاں!" ماں نے غصے سے مگر آہستہ سے کہا۔

"بھوک لگی ہے"

"لگا کرے۔ میں نے کہہ دیا آج نہیں ملے گا تجھے کھانا"

"بہت بھوک لگی ہے" وہ گڑگڑایا۔

"کچھ بھی ہو۔ آج تجھے بھوکا ہی سونا پڑے گا۔ تیری یہی سزا ہے"

"کیا بات ہے؟" باپ نے ٹہلنا جاری رکھتے ہوئے ایک لمبی ڈکار لے کر پوچھا۔

ان کی آواز میں گرج تو وہی تھی جس سے وہ سہم جایا کرتا تھا مگر غصے کی تلوار نہیں تھی۔ ابا تو بُرے نہیں۔ اماں بلا وجہ ڈرایا کرتی ہیں۔ پیار بھی کرتے ہیں۔ کل لیمن چوس لا کر دیئے تھے۔

وہ لاڈ میں آگیا "دیکھو ابا۔ اماں کھانا نئیں دے رئی ہیں"

"کیوں نہیں دیتیں کھانا لال بیٹے کو؟"

اب دیکھیں کیسے نئیں دیتیں کھانا۔ لال بیٹا میں تو کالا ہوں۔ مگر پیار میں مجھے ہمیشہ لال بیٹا کہتے ہیں۔

"میری شکایتیں کرنے چلا ہے" ماں اٹھ کھڑی ہوئیں "اور اپنے کرتوت نہیں بیان کرتا"

"ہوا کیا؟"

"دیکھو ابا" وہ صحن میں آگیا اور باپ سے قدم ملانے لگا "وہ علتو ہے نا وہ علتو"

"ہوں!"

"— تو وہ علتو اسے مدن کو مار رہا تھا۔ جوتوں سے"

"کیوں؟"

"کیتا کہتا میرے دس روپے نہیں دیئے اس نے"

"یہ کمبخت فقیر ہر وقت لڑا کرتے ہیں"

"ہاں۔ اور بابا وہ بچارے کو کنکروں پر گھسیٹ رہا تھا اور اس کے"

"ہوں"

"ساری یوسف زلیخا سنا ڈالے گا اور یہ نہیں بتائے گا کہ تونے کیا کیا" ماں بیچ میں بول پڑیں۔

"کیا کیا اس نے؟"

باپ ابھی تک ٹہل رہے تھے۔ لیکن اب ان سے قدم نہیں ملا رہا تھا۔

"سر پھوڑ دیا اس عنتوا کا اور کیا کیا"

باپ ایک لمحے کے لئے رکے "سچ!"

اور نہیں تو کیا"

"کیسے؟"

"اٹھا کر گملا دے مارا اس کے سر پر"

"کیوں؟"

"وہ مدن کو جو مار رہا تھا۔ بڑا آیا مدن کا سگا"

"غلطی سے لگ گیا ہوگا"

"نہیں وہ شکایت لیکر آیا تھا۔ میں نے خود دیکھا اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور میں نے ڈانٹا تو کہنے لگا میں تو اور پھوڑں گا اس کا سر"

اتی بڑی ہو کر بھی اماں جھوٹ بولتی ہیں میں نے یہ کب کہا تھا۔ میں نے تو صرف ہاں کہا تھا۔

"مگر بابا وہاں بہت سے لوگ تھے لیکن مدن کو کوئی نہیں بچا رہا تھا"

"تو تو اقرار کر رہا ہے کہ تو نے عنتوا کا سر پھوڑا"

وہ خاموش رہا۔ باپ کی آواز میں اب تلوار چمک رہی تھی۔

"بول"

"وہ پھر بھی چپ رہا"

"اور اوپر سے سینہ زوری کرتا ہے۔ اور پھوڑوں گا اس کا سر۔ وہ اگر رسید کر دیتا دو جھانپڑ تو عزت خاک میں مل جاتی کہ نہیں۔ وہ مدن کو مار رہا تھا تو مارنے دیتا وہ چاہے اسے جان سے مار ڈالتا تجھے اس سے کیا مطلب۔ بالشت بھر کا ہوا نہیں اور ابھی سے لفنگوں بچوں کی عادتیں سیکھنے لگا"

"یہی تو میں کہتی ہوں کہ اگر ابھی سے سختی نہیں کی گئی تو بالکل بگڑ جائے گا۔ میں نے تو کہہ دیا آج کھانا نہیں ملے گا"

"ایک وقت کھانا نہ ملنے سے کیا ہوگا۔ مرغا بنادو اسے"

"وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئے": چل۔ بن چل کے مرغا:"

اور جب وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا تو باپ نے اپنی آواز میں کئی بادلوں کی گرج بھر کر ڈانٹا "چلتا ہے کہ"

وہ سہم گیا۔ باپ نے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ وہ جا کر دالان میں مرغا بن گیا۔

چراغ جل گئے۔ سب سوائے نانی کے کھانا کھا چکے۔ باپ اور ماں اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور وہ مرغا بنا رہا۔ اس کے ہاتھ دکھنے لگے۔ اس کی کمر دکھنے لگی۔ اس کے کان جلنے لگے۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ مگر وہ رویا نہیں۔ سزا نے اس شئے کو جو اس کے اندر کہیں چھپی ہوئی تھی اور جو کبھی کبھار پگھل پگھل کر اس کی آنکھوں کے راستے بہا کرتی تھی سخت کر دیا تھا۔ دو ایک بار اسے یہ خیال آیا کہ چپکے سے باورچی خانے میں سے کچھ نکال کر کھائے۔ خالی روٹی ہی سہی اور پھر مرغا بن جائے مگر اس نے اس خیال کو زیادہ دیر تک ذہن میں نہیں ٹھہرنے دیا۔ کوئی چیز اس کے اندر کمان کی طرح کھنچ گئی تھی جو اس فعل کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ کوئی چیز جو اس سے کہہ رہی تھی کہ تیرے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ تجھ پر ظلم ہو رہا ہے۔ تو اس ظلم اس ناانصافی کا مقابلہ چاہے کسی طرح کر چوری کر کے نہ کر۔ ہاں چوری! بھیا جو آرام سے بستر میں گھسا کتاب پڑھ رہا ہے کیا کہے گا! ۔ اور نانی کیا کہے گی جو نہ جانے کیوں چپ ہیں جو نہ جانے کیوں لیٹی نہیں جو بیٹھی ہوئی نہ جانے کیا سوچ رہی ہیں!۔

لیکن اس کے جسم میں ایک اور شئے بھی تھی جو پہلے تو آہستہ آہستہ اس کے معدے کو کھرچ رہی تھی اور اب گویا نکیلے چاقوؤں سے اس میں ہزاروں نہیں لاکھوں چھید کر رہی تھی اور آہستہ آہستہ یہ شئے اس کے اندر کی دنیا کی دیگر تمام اشیاء پر حاوی ہو گئی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

پھر نانی بستر سے اٹھیں اور اس کے پاس آئیں۔ انہوں نے پہلے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر اسے مرغے سے انسان بنایا۔ اور جب یہ انسان اکڑی ٹانگوں پر کھڑا ہوتے ہوتے لڑکھڑایا تو انہوں نے اسے سہارا دے کر اپنی ٹانگوں سے لگا لیا۔

"بہت بھوک لگ رہی ہے نانی": اس نے سسکی کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے میرے لال": انہوں نے اس کے سر پر دوبارہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "جاؤ جا کر ابا سے معافی مانگ لو۔ وہ ضرور معاف کر دیں گے"

مافی! اس کے حلق میں جیسے ایک گولا پھنس گیا۔ کاہے کی مافی! نانی تم بھی!۔

اور نانی نے گویا اس کی بے آواز احتجاج کو سمجھ لیا: "ورنہ کھانا نہیں ملے گا اور مرغا الگ بننا پڑے گا"

کئی ہزار لمحات میں تنگ آنگن کو پار کر کے جب وہ اس سے بھی تنگ کمرے کے دروازے پر پہنچا جو اکثر بھڑا رہا کرتا تھا۔ اندر سے حقے کی گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ کئی ہزار لمحات تک وہ بلاوجہ اس گڑگڑاہٹ پر کان لگائے رہا۔ اور پھر اپنے آنسوؤں پر بدقت تمام قابو پا کر اس نے بھڑے ہوئے دروازے سے منہ لگا کر کہا۔

"ابا ماف کر دیجئے۔ اب ایسی غلطی نئیں کروں گا"

ابھی آخری لفظ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا کہ اس کے اندر وہ شئے جو کمان کی طرح کھنچی ہوئی تھی چٹاخ سے ٹوٹ گئی اور آنسوؤں اور سسکیوں کا ایک بہت بڑا سیلاب ایک حقیر تنکے کی طرح بہا لے گیا۔

رحمان مذنب
کامران (سرگودھا)

ناؤ اور بھنور

صابراں نے کہا۔ تو عیداں نے مٹی کا دیا پھر کڑوے تیل سے لبالب بھر دیا۔ اور بتی اونچی کر دی۔ پر اس سے کیا ہوتا؟ دیا پہلے کی طرح نیم جان جمال کی طرح ٹمٹماتا رہا۔ کوٹھڑی اندھی کی اندھی رہی۔ بھلا وہ اندھیرا کیسے دور ہوتا جسے مایوسی کی کوکھ نے جنم دیا اور پروان چڑھایا گھر کا سامان یوں بے ترتیب پڑا تھا جیسے زندگی کے عناصر بکھر گئے تھے۔ ایک بار جو برتن کٹھرے سے اترا۔ پھر وہاں نہ گیا۔ کوٹھڑی اور آنگن ہی میں ٹھوکریں کھاتا رہا۔ صندوقوں کا یہ حال کہ ادھر ادھر جگہ بے جگہ پڑے رہتے۔ کھرلی میں چارے کی بجائے شکستہ چارپائی کے سیرو پائے، مدھانی، چاٹی، چرخہ اور خالی ڈبے پہنچ گئے۔ صابراں کا گھر جو بستی بھر میں ذوقِ ترتیب کے اعتبار سے مشہور تھا کباڑ خانہ بن کر رہ گیا۔ یہ سب جمال کی وجہ سے ہوا جو سدھ بدھ کھوئے، پلنگ پر اوندھے منہ پڑا ابلیپت میں سانس لے رہا تھا۔ صابراں پاس بیٹھی سر دبا رہی تھی۔ باہر آنگن میں پڑوسنیں بیٹھی تھیں جیسے گدھ لاش کے انتظار میں ہوں۔

اس وقت نورنگر جگمگا رہا تھا۔ چاندنی کیا کھلی تھی، چنبیلی کی کلیاں کھلی تھیں۔ پوری فضا مہک رہی تھی۔ کائنات غسلِ سیمیں کر رہی تھی۔ جھیل پر پریاں اتر رہی تھیں۔ دور کی خاموش پہاڑیاں ان کے مسکن معلوم ہوتی تھیں۔ راست قامت یوکلپٹس اس شان سے قطار در قطار کھڑے تھے جیسے پلٹن کے جوان محاذ کی حفاظت کر رہے ہوں۔ ہوا کے بدست جھونکے جھوم جھوم کر ان میں سے نکل جاتے۔ کتنا سکون تھا اس روپہلی جنت میں لیکن صابراں کی کوٹھڑی میں تو سکون کا نشان بھی نہ تھا۔ وہاں ہر ذرہ حسین تھا اور یہاں زندگی کھنڈر ہو رہی تھی۔ اس پر بھی شہناز کے کلیجے میں ٹھنڈک نہ پڑی۔ صابراں کی بس اتنی ہی خطا تھی کہ وہ اتفاق سے جمال کی بیوی اور عیداں کی بہن تھی۔ شہناز تو یہ کھنڈر بھی نہ دیکھ سکتی۔ اسے نورنگر کی تثلیث سے ازلی بیر تھا۔ اس کے جی میں تھی۔ کہ تینوں کو ایک کو لہو میں پلوا دے۔ ویسے کولہو کا تو بس تکلف ہی تھا۔ صابراں اور عیداں دونوں بہنیں بس کانچ کی پتلیاں تھیں۔ انہیں تو کولہو کے بغیر ہی چکنا چور کیا جا سکتا۔ پر کیا کرتی؟ بس نہ چلتا۔ خالد قلعے کی دیوار بن کر بیچ میں آن کھڑا ہوا۔ وہ جب صابراں اور عیداں پر وار کرتی خالد جھیل لیتا۔ وہ تو جل جھلس کر رہ جاتی اور خالد مسکرا دیتا۔ خالد کا کوئی کیا بگاڑتا؟ اگر شہناز نواب صاحب کی چہیتی بیگم تھی تو خالد ان کا چھوٹا بھائی تھا۔ یہی نہیں بلکہ خالد کے لئے شہناز کا دل گداز تھا —— وہی دل جو صابراں اور عیداں کے لئے پتھر تھا۔ شہناز کے نزدیک اسی تثلیث نے "نواب محل" میں دراڑ ڈالی۔ اس نے خالد کو شہناز سے کھسیٹا۔ خالد اور عیداں میں پیار کا بیج بویا۔ شہناز جس پودے کو اپنے خون سے سینچتی رہی اور اپنی آرزوؤں کی حرارت دیتی رہی وہ جل جھلس گیا۔

تعلق خاطر تو عیداں ہی سے ہوا لیکن خالد اسکی بہن کو کیونکر نظر انداز کرتا۔ اصل میں اسی کی در پردہ وساطت سے "نواب محل"

کی عزبی فصیل کے عقب میں خالد اور عیداں کی ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا ۔ پھر ادھر جمال صابراں کا گھر والا ٹھہرا ۔ ایک کی خاطر خالد کو تینوں کا ساتھ دینا پڑا ۔

خالد نے خوب مقابلہ کیا، وار پر وار جھیلا لیکن شہناز سے کون نمٹتا جو ہر آن نیا ماحول تراشنے اور واقعات کو نئے موڑ پر لانے کی تدبیریں کرتی ۔ اسے کب چین پڑتا ؟ حالات کی یہ جنم دیوی ہواؤں کا رُخ بدلتی رہتی ۔ اگرچہ نوزنگر گوشۂ عافیت تھا ۔ لیکن صابراں تو یہاں چاند کی چھاؤنی میں اُجڑتی رہی ۔ شہناز کے فتنوں سے بچنے کے لئے اُس نے شہناز کا شہر چھوڑا ، "نواب محل" سے اُٹھ آئی لیکن شہناز کے قہر نے پیچھا نہ چھوڑا شہناز نے تثلیث کو مٹانے کی ٹھانی ۔

یوں تو شہناز جادوگری سے کم نہ تھی ـــــ چمکتے دمکتے ہوئے سنہری بال بل کھاتے لہراتے تو دیکھنے والوں کے دل ان میں جھولنے لگتے، دیکھنے والوں کی نظریں تار تار میں پروئی جاتیں اور آرزوئیں ان میں کھوئی جاتیں ۔ اس کی سیاہ آنکھیں جو فجر کے کنوارے افق کی طرح اُجلی تھیں اور جنھیں کھولنے کی وہ شاذ ہی زحمت گوارا کرتی ۔ اساڑھ کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں گھنیرے پیڑ کی چھاؤں بن کر خنکی پہنچاتیں لیکن پھر وہ تھکے ماندے راہی کو چت بھی کر دیتیں ۔ ڈسنے پر آتیں تو شوریدہ زمین کے سانپ سے بڑھ کر جان لیوا ثابت ہوتیں ۔ روشنیوں کے شہر کا سارا اُجالا اور سارا زہر انہی میں سمٹ آیا تھا ۔ یہ جادوگری، یہ افرادی بے روک ٹوک دلوں پر راج کرتی لیکن جب خالد نے ہر حملہ پسپا کیا ۔ تو اُس نے پیشہ ور جادوگر سے رجوع کیا ۔

جادوگر پر تو وہ یوں ایمان لائی جیسے وہ تائید آسمانی لے کر آیا ہو حالانکہ اُسے فقط تائید شیطانی حاصل تھی اور یہ شیطان تو خود شہناز کے اندر بول رہا تھا ۔ شہناز کے انگ انگ میں اس کی آواز گونجتی ۔ اس کا دماغ شیطان کی پسندیدہ اقامت گاہ تھی ۔

جادوگر کا نزول یونہی نہیں ہوا ۔ پہلے اس کے چیلے چانٹوں نے بڑی ہوشیاری سے شہناز تک رسائی پائی اور پھر اُستاد کے لئے میدان ہموار کیا ۔ اُستاد کے اوصاف گنواتے وقت اس بات پر بار بار زور دیا کہ اُستاد قرآن کے حافظ اور سفلیات کے یکتا عامل ہیں اس کے بعد جادوگر نے ملاقات کی تو بڑے وثوق سے کہا کہ سات رات کے چلّے سے نوزنگر کی تثلیث جل کر خاک ہو جائے گی اور خالد شہناز کے قدموں میں آ گرے گا ۔ جب جادوگر نے پانچ ہزار فیس طلب کی تو شہناز اس کے کمال کی قائل ہو گئی ۔

صابراں اور عیداں کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی کہ "نواب محل" میں اُن کے خلاف سازش کی گئی ہے ۔ دونوں بہنیں نوزنگر میں بیٹھیں مصیبت بھوگ رہی تھیں ۔ ایک اپنے چاہنے والے سے جدا تھی، ایک اپنے خصم کے غم میں گھل رہی تھی ۔ جمال زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا لیکن پھولوں کے ہجوم کی تیتری ـــــ شہناز خوش تھی ۔ چلّے سے ایک رات قبل اُس نے سہیلیوں کو بلایا ۔ سنہری اور شوخ اپسراؤں کا جھنڈ "نواب محل" میں چلا آیا ۔ تو ہر طرف حسن کے فانوس جل اُٹھے ۔ بڑا لان چمکتے دمکتے، مہکتے لہکتے ہوئے پھول ستاروں سے سج سنور گیا ۔ فضا نے دھنک روپ لے لیا ۔ رات کو چراغاں ہوا تو رنگ رنگ کے اُجالے پھیل گئے اور جب اُن سے پھولوں کی مہک کا جادو ٹکرایا تو ہوش اُڑنے لگے ۔ کپڑوں کی وہ بہار کہ سات ولایتوں کی جان کھنچ آئی اور چودہ طبق روشن ہو گئے ۔ پندرھواں طبق وہ آپ تھیں ۔ سہیلیاں مل کر ناچیں گائیں تو شوخیوں اور شرارتوں کا سہ آتشہ کشید ہو کر لان میں لنڈھایا گیا ۔ یہ لبریز پیمانے یہ رواں دواں جوانیاں یہ نشوں کے بھرپور شکنجے یہ بے فکری کے یہ چھلاوے اُس وقت تک ہنگامہ بپا کئے رہے جب تک ایک ایک رنگ چھٹنے نہ لگا اور ٹوٹ ٹوٹ کر بدن زمین پر نہ گرنے لگے پھر جوانی کے کھنڈر اور حسن کے اس ملبے پر ابلیس نے قہقہے لگائے ۔

شہناز نے خواب میں ابلیس کی زیارت بھی کی ۔ مدتوں کی آرزو بر آئی ، وہی جو اس میں مخفی تھا ۔ در پردہ اس میں بولتا رہتا ، اس کے شعور میں دندناتا رہتا ۔ سامنے جلوہ گر ہوا ۔ اس کی آنکھیں سلگ رہی تھیں اور لمبی لمبی مخروطی انگلیوں میں سے انگاروں کے انار چھوٹ رہے

تھے نورنگر کی دلفریب وادی پھولوں سے پٹی پڑی اور بہار مُسکرا رہی تھی۔ ابلیس اڑکر نورنگر پہنچا۔ شہناز بھی پیچھے پیچھے گئی۔ ابلیس نے اس زور کا قہقہہ مارا کہ نورنگر کی پہاڑیوں میں درزیں پڑ گئیں۔ اُس کی آتش ریز انگلیوں سے انگارے جھڑ جھڑ کر پھولوں پر گرے۔ پھول شعلہ بن بن کر اُڑے۔ فضا میں اُڑنے والے شعلہ نما پھول آئینہ رو جھیل پر رقصاں ہوئے۔ دیکھتے دیکھتے جھیل جل اُٹھی پھر گاؤں کی گوریوں میں بھاگڑ مچ گئی۔
وہ چیختی چلاتی، واویلا کرتی کوٹھوں پر چڑھ گئیں۔ عیداں بھاگ کر ایک پہاڑی پر پہنچ گئی۔ جہاں ایک بار یوکلپٹس تلے وہ خالد سے ملی تھی۔ جہاں انھوں نے پیمان باندھے تھے صابراں بھی وہیں پہنچی۔ ان کی فریاد بستی کے شور محشر میں صاف سنائی دینے لگی۔ دونوں بہنیں بُری طرح بال نوچنے اور کپڑے پھاڑنے لگیں۔ انہوں نے بے وارث ہو کر کہا۔ "خالد ہمیں بچاؤ، للّٰہ بچاؤ۔"
اس کس مپرسی کے عالم میں یوکلپٹس کا دل بھی پگھل گیا۔ وہ اُن کے پیار کی نشانی تھا۔ اسے وہ منظر یاد تھا جب خالد اور عیداں اس کی چھاؤں میں ملے تھے اور انہوں نے آرزوؤں کی حرارت سے فضا کو گرمایا تھا۔ وہ گھڑی کتنی حسین تھی اور اس سے یوکلپٹس کے حُسن کو کس طرح چار چاند لگ گئے تھے! وہ انمول ہو گیا اور اسے لازوال زندگی مل گئی۔ وہ اپنے آپ پر نازاں تھا۔ پوری وادی میں وہی تو ایک تھا جسے محبت کے ماروں کو پناہ دینے کی سعادت حاصل تھی۔ وہ عیداں کی حالت دیکھ کر رہ نہ سکا۔ اس نے بھی خالد کو پکارا لیکن خالد وہاں کہاں؟ دونوں بہنیں تو کیا، ساری وادی فریاد کرتی رہی۔ انبوہ کی اس زبوں حالی پر ابلیس ناچتا رہا۔ شہناز دُور کھڑی دیوانہ وار قہقہے لگاتی رہی چیخوں اور فریادوں کے ہجوم میں شعلہ فشاں جھیل نے بڑھ کر پھیل کر پوری بستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تمام کوٹھیاں، تمام ٹیلے آتشیں رقص میں چھپ گئے انجام کار یہ منظر اتنا بھیانک ہو گیا کہ شہناز میں دیکھنے کی تاب نہ رہی چیخوں کے شور سے اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ قہقہوں کا تانتا ٹوٹا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس کا چہرہ یوں دمک اُٹھا جیسے اُفق کے ترازو میں سیندوری سورج تُل رہا ہو۔ وہ یوں مُسکرانے لگی جیسے سویرے سویرے مشرق کے سجرے ہونٹوں پر کرن نکھر جائے اس نے یقین کر لیا کہ جادو سر چڑھ کر بولے گا۔ صابراں، عیداں اور جمال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اندھیروں کی نامعلوم گہرائیوں میں چلے جائیں گے وہ ان کے مدفن پر اپنی خوشیوں کا ایوان تعمیر کرے گی۔ پانچ ہزار میں تو سودا بالکل سستا تھا۔ تثلیث کی تباہی اور خالد کے حصول کی یہی کوئی قیمت بیش قیمت تھی۔ ایک دفعہ اس کا خواب سچا تو ہو جائے پھر وہ جادوگر کو مستقل طور پر اپنے یہاں رکھ لے گی۔

چلّے کی رات آسمان پر گہری تاریکیاں چھا گئیں۔ چاروں طرف کالے کالے تہ دار بادل پھیل گئے۔ ہوا تلوار ہو گئی۔ تیز اور تیکھے جھونکے بپھر کر فضا کی دھجیاں اڑانے لگے ایسا لگا جیسے یاجوج ماجوج دیوار چین پھاڑ کر نکل آئے ہوں بجلی کا چمکیلا بھالا گاہے گاہے تاریکی کا سینہ چیر کر گزر جاتا اور پھر دل دہلانے والی کڑک کے ساتھ ذرا کی ذرا کے لئے روشنی کی چادر بچھ جاتی۔ کون جانے یہ قیامت روشنیوں کے شہر کا سکھ چین لوٹنے آئی تھی یا نورنگر پر ٹوٹنے۔ صابراں اور عیداں کو ان گہری تاریکیوں، تہ دار بادلوں اور ہوا کی تلوار کا کب پتہ تھا؟ وہ تو ان کے بغیر بھی اندھیروں میں بھٹک رہی تھیں۔ شہناز نے جو اندھیرے بوئے تھے انہوں نے بڑھ کر پھیل کر تثلیث کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اب تینوں کی حالت صحرا کے بیچوں بیچ راستہ بھولنے اور جان گنوا بیٹھنے والوں کی سی تھی۔

چلّہ زوروں پر تھا۔ اور اندھیرا بھی۔ "نواب محل" اندھیرے کا تو وہ بن گیا۔ اس کی وہ رعنائی اور زیبائی جس پر روشنیوں کے شہر کو ناز تھا تاریکیوں کا گنبد بن گئی۔ آج کی رات نے چنگیز اور ہلاکو کے کارناموں کی ساری سیاہی سمیٹ لی کشادہ سڑکوں پر برقی قمقموں کا سلسلہ منتشر پراسرار لگا۔ اگرچہ اکثر ایوان ابھی تک روشن تھے اور اُن کے اُجلے شیشوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہی تھیں لیکن گرد و غبار نے رنگ پھیکا کر دیا۔ ریگ زار فلک پر تاروں کے درخشاں قافلے ناپید ہو گئے۔ "نواب محل" پر اُڑنے

والی اونچے پیڑوں کی بڑی بڑی چمگادڑیں چپ چاپ تناور شاخوں سے الٹی لٹکی ہوئی تھیں۔ ان کے لئے سخت بیقراری کا سماں تھا۔ وہ آوارہ چیلیں بھی غائب ہو گئی جو رات گئے منڈلانے کو نکلتی۔ ان سب کی جگہ گرد و غبار اُڑ رہا تھا۔ "نواب محل" کے نیم روشن کمرے گہری نیند میں تھے اور رات کو دیر تک جاگنے کی تھکن دور کر رہے تھے۔ باہر ہوا خراٹے لے رہی تھی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ باہر ایک عالم درہم برہم ہے۔ البتہ بالائی کمرہ بیدار تھا جس میں ادھیڑ عمر کے جادوگر کی گھمبیر آواز بڑی باقاعدگی سے ایک نئے اور تال میں اُبھر رہی تھی۔ یوں ماحول اور بھی بھیانک ہو گیا۔

افضل خاں نور نگر سے صابراں اور عیداں کا ضروری پیغام لے کر آئے وہ خالد کے مہمان تھے۔ تہجّد کی نماز کے لئے بیدار ہوئے ان کا کمرہ جادوگر کے کمرے سے متصل تھا۔ برآمدے سے برآمدہ ملا ہوا تھا اور بالکنی سے بالکنی ملی ہوئی تھی لیکن ان کے مکینوں کے دل کبھی نہ ملے۔ بظاہر درمیان میں اکہری اینٹ کی دیوار کھینچی تھی لیکن اصل میں زمین اور آسمان کے فاصلے تن رہے تھے۔ شہناز نے تو دیوار برآمدے اور بالکنی کی طرح متصل ہونے کی کوشش کی۔ لیکن خالد ہی عیداں کو درمیان میں لے آیا۔ صابراں اور جمال نے درمیانی ستون کو مضبوطی سے استوار رکھا۔

شہناز جو ایک عہد آفریں ہستی تھی، جو واقعات کا رخ موڑتی، اپنی مرضی کے حالات پیدا کرتی اس درمیانی دیوار کو ہٹا نہ سکی جمال اُس کا مالی، صابراں مالن اور عیداں مالن کی خوبصورت بہن ——— خدمتگاروں کی اس تثلیث کی یہ مجال کہ مالکن کے منہ آئے وہ انہیں تہس نہس نہ کر دے۔ تثلیث کو تہس نہس کرنے کا موقعہ مل ہی جاتا۔ لیکن وہ نور نگر پہنچ گئی تاہم جمال کی حالت غیر ہو گئی نور نگر جانے سے بہت پہلے لال شاہ کے تکیئے کے مجاور نے شہناز کی شہ پر اسے نشوں کی سان پر ایسا چڑھایا کہ وہ چت ہو کر ہی رہا۔

اگرچہ افضل خاں پہلے بھی کئی بار خالد کے یہاں آئے لیکن انہوں نے یہ مہیب آواز کبھی نہ سُنی جو اس وقت برابر کے کمرے میں سے آ رہی تھی۔ پورا کلام تو اُن کی سمجھ میں نہ آیا تاہم صابراں، عیداں، جمال، نور نگر، عزازیل، جن بھوت ایسے نام انہوں نے صاف صاف سُنے سمجھ گئے کہ دال میں کالا ہے اور بہت بڑا کالا ہے۔ اشتیاق بڑھا اور اُن میں وہ سپاہی بیدار ہوا جس نے بڑی بے جگری سے اغیار کی خاطر دو جنگیں لڑیں اور سراغ رسانی کے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ ان کی جیب پر سہ رویہ تمغے لٹکتے۔ اور ان کی عظمت کی شہادت دیتے۔ آج تو جیسے اپنی ہی جنگ کے لئے ان میں سپاہی بیدار ہوا۔ وہ حقیقت حال جاننے کے لئے بے وار ہوئے۔ جوتے اُتار، دیوار پھاند، چُپ چاپ برابر کے برآمدے میں پہنچے دھیرے دھیرے دروازے کے پاس گئے۔ ہوشیار اور فن کار سراغ رساں کی طرح اوٹ میں کھڑے ہو گئے ہاتھ میں مضبوط ڈنڈا تھامے ہوئے تھے۔ کمرے میں تیل اور بنولے سے بھرے دیئے جل رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کا سپید ریش ور جادوگر سیاہ جبہ پہنے ہوئے تھا۔ جبہ بھی سیاہ اور جادوگر کا رنگ بھی سیاہ۔ پتہ نہ چلتا کہ جبہ کہاں تمام اور جادوگر کہاں سے شروع ہوتا۔ وہ پورے بدن کو جھما جھما کر نہایت جوش و خروش سے کلام پڑھتا۔ گز دو گز لمبی کالی تسبیح کے موٹے موٹے دانے بڑی تیزی سے اس کی انگلیوں میں پھسلتے۔ سامنے راکھ اور مٹی کی قبر بنی تھی۔ اوپر لہو بھرا پیالہ دھرا تھا جس میں انسانی کھوپڑی آدھی ڈوب رہی تھی۔ اردگرد دو عورتوں اور ایک مرد کے کٹھ پتلے پھانسی چڑھے تھے۔ چاروں طرف دائرے کی صورت لال لال اور کالی کالی لکیریں کھینچی تھیں۔ افضل خاں بڑے اطمینان سے جادوگر کی حرکات و سکنات دیکھتے رہے۔ اب سا[ری] بات ان کی سمجھ میں آگئی جادوگر بدروحوں کو بُلا رہا تھا تاکہ وہ آکر صابراں، عیداں، جمال اور نور نگر کو برباد کریں۔

افضل خاں سے رہا نہ گیا۔ نور نگر اُن کا ٹھیرا۔ رہی صابراں اور عیداں، سو اُن کی بھتیجیاں تھیں۔ پوری قوت سے الا اللہ کا نعرہ بلند کر کے کمرے میں کود پڑے۔ اس اچانک حملے سے کالے علم کا سیاہ رو عامل ڈر سہم گیا۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ کوئی غلط بدروح آ ٹپکی ہے اور کا[م] میں کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔ پھر ذرا سنبھلا تو اصل صورتِ حال کا پتہ چلا۔ اپنی بڑی بڑی لال انگارہ آنکھیں پوری طرح کھول کر کرخت لہجے میں

"کون ہے تو؟"

"جسے تو نے بلایا تھا؟"

"تجھ مردود کو کس کم بخت نے بلایا تھا؟"

"تجھ مردود اور کم بخت نے"

"جاہل انسان! تو جادوگر کے گھیرے میں ہے، جل مرے گا"

"جل مرنے سے پہلے میں تیرا سر کچل دوں گا۔ تو یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟"

"تجھے اس سے کیا، فوراً یہاں سے نکل جا۔ ورنہ تیرے ساتھ باقی لوگ بھی تباہ ہو جائیں گے"

"شیطان کے بچے! تو صابراں، عیداں اور نور نگر کو تباہ کرنا چاہتا تھا؟"

"ہاں میں سب کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ خیریت چاہتا ہے تو فوراً یہاں سے نکل جا!"

"حرامی موت! تیرا بھیجا پھوڑ کر ہی میں یہاں سے نکلوں گا"

اب تو جادوگر بھی جلال میں آیا لیکن اس کا فن آڑے نہ آیا۔ اس کے پاس ایسا کوئی منتر نہ تھا۔ کہ ادھر پھونکے اور ادھر کھڑے کھڑے دشمن پتھرا جائے یا جل بھن جائے۔ تاہم اس نے دشمن سے نمٹنا چاہا۔ سامنے پڑے ہوئے خنجر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ابھی اسے چھوا بھی نہ تھا کہ زن سے اس کی کلائی پر ڈنڈا پڑا اور ساتھ ہی ہڈی ٹوٹنے کی صدا آئی اسی کے ساتھ ایک چیخ بھی نکلی۔ عامل کلائی پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔ قریب کے دو تین دیئے چھوٹ گئے۔ تیل اور بنولے فرش پر بہہ گئے۔ ایسا لگا جیسے جادو دا ندھ کر اسی پر آ پڑا ہو۔ آندھی کچھ ہلکی ہوئی اور دیوں کی لَو استوار ہو گئی۔ بادل بھی چھٹے اور بجلی کی کڑک بھی تھم گئی۔ گویا جادو کا طلسم ٹوٹا۔ لیکن۔ لیکن نیا طوفان کھڑا ہو گیا۔ جادوگر یوں تڑپ تڑپ کر چیخنے لگا کہ آسمان سر پر اٹھا لیا "نواب محل" کی آنکھ کھل گئی۔ ہر طرف برقی قمقمے سلگ اٹھے۔ دروازوں کے بولٹ اترنے اور بھاگنے دوڑنے کا شور برپا ہوا۔ سب سے پہلے شہنانہ خواب گاہ میں سے برآمد ہوئی۔ ابھی پوری طرح ہوش میں بھی نہ آئی۔ ہپوٹے بوجھل بوجھل سے تھے۔ اور ان میں نیند آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ بے ترتیب لٹیں لومڑی کے بالوں کی طرح بکھر گئیں۔ اس پر بدن ڈھانپنے کی بس تہمت ہی تہمت تھی۔ نائیلون کے لباس میں کب بدن چھپا ہے۔ مس باربرا اور جنیلی کا لباس بھی ویسا ہی تھا۔ جادوگر دوہرا ہو ہو کر چیختا چلا تار ہا۔ افضل خاں اس کی ہڈیوں پسلیوں پر زور زور سے ڈنڈے برساتے رہے۔ شہنانہ نے ذرا توقف کیا اور پھر جب پانچ ہزار کی توہین ہوتے دیکھی تو جھلا کر کہا: "یہ کیا بے ہودگی ہے؟"

"بہت بڑی بیہودگی ہے۔ یہ پاکھنڈی نور نگر کو تباہ کرتے کرتے، نواب محل کو تباہ کرنے چلا تھا۔ منتر تو اسے ٹھیک سے آتے ہی نہیں" افضل خاں نے دیوں کے دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے میں سے باہر آتے ہوئے کہا۔

"یہ بکتا ہے۔ میں الٹے قرآن کا عامل ہوں۔ میں صابراں، عیداں، جمال اور نور نگر کو سات دن میں تباہ کر سکتا ہوں"

بھانڈہ پھوٹتے دیکھ کر شہنانہ سخت پیچ و تاب کھانے لگی۔ ادھر خالد تھا، ادھر اس کی سوکنیں تھیں۔ تاہم اس نے حواس برقرار رکھے۔ جھٹ جادوگر کو آنکھ مار کر کہا: "چل، حرامی مردود! تجھے کس نے کسی کو تباہ کرنے کو کہا تھا؟ جانے کون تجھے بہکا لایا۔ فوراً یہاں سے دفع دفعان ہو۔ زبان کھولی تو پستول مار دوں گی" پھر اس نے اپنی باتوں کا ردعمل معلوم کرنے کے لئے خالد اور سوکنوں کو دیکھا لیکن وہاں تو سب پہیلی بنے کھڑے تھے۔ کوئی نہ سمجھا کہ کیا ماجرا ہے: "نواب محل" میں اب یہ کیا گل کھلا ہے۔ گل کھلانے میں شہنانہ جواب نہ رکھتی۔ ہر کبھی نئے گل کھلاتی نئے نئے حالات اور واقعات کو جنم دیتی بس ایک بچے کو جنم دینے سے قاصر تھی۔ باقی بیگمات اولاد والی تھیں۔ اسی لئے اپنی حد میں رہتیں۔ انہیں ڈر خوف بھی تھا لیکن شہنانہ کو چھنگلی بھر پروا نہ تھی وہ تو اپنی چھنگلی پر ایک دنیا کو نچا لیتی۔ نواب ارشد کی چہیتی بھی تھی اور ان کی کمزوری بھی۔

اور مالٹے کے بجائے انگلی کٹ گئی۔ صابراں کو خبر نہ ہوئی۔ عیداں نے چپکے سے ڈیٹول سے پٹی ترکی اور انگلی پر باندھ لی۔ مالٹے کاٹے، جمال کے آگے رکھے اور پھر "نواب محل" کی غربی فصیل کے عقب میں چلی گئی۔

دیئے کی لَو کافی تیز تھی، تیل لبالب بھرا تھا اور بتی کافی موٹی تھی۔ پھر بھی وہ اندھیرے نہ چھٹتے۔ جو زندگی سے بیزار ہونے پر جنم لیتے۔ جمال کو "نواب محل" کی ناگن نے ڈسا۔ اور لال شاہ کے تکیئے کی زہریلی آب وہوا نے چٹ کیا۔ اب وہ یوں اوندھے منہ پڑا تھا۔ جیسے زندگی کا لبریز پیمانہ اوندھا رہا ہو۔ اس کا بے جان وجود ویرانے کی طرح بھیانک تھا۔ سانس کی ڈوری کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتی۔ وہ ایک عظیم کھنڈر تھا جو کبھی ایک عظیم عمارت تھا۔ ایسے میں صابراں کو عظیم عمارت کا خیال آیا۔ یہ عمارت کس قدر روشن اور شاندار تھی اس کا خیال آتے ہی کمرے کا دیا وادی پر تابانی بکھیرنے والے چاند کی طرح روشن ہوگیا۔ لَو قہقہہ بن گئی۔ در و دیوار چمک اٹھے۔ زندگی شعلۂ برق بن گئی اور جمال جوانی کے روپ میں سامنے آیا۔ اس کے انگ انگ میں زندگی کا تند و تیز دھارا بہنے لگا۔ اسی مرعوب کن قد و قامت اور جسم و جان پر شہناز فریفتہ ہوئی۔ پھر جب اس کی فریفتگی کا بھانڈا پھوٹا تو جمال کی دشمن ہوگئی۔ شہناز کا خیال آتے ہی تصور کا دلآویز تانا بانا بکھر گیا اور ہڈیوں کا وہ سوکھا کھنک ڈھانچہ پھر سامنے آگیا۔ جیسے چاہے تو چولھے میں ایندھن کی جگہ جھونک لو۔ دیا پھر ٹمٹمانے لگا۔ صابراں اپنی امنگوں اور حسرتوں کے کھنڈر پر بیٹھی رونے لگی۔

اتنے میں چچا افضل خاں آگئے۔ صابراں نے آنسو پونچھ لئے۔ اس کی صورت پر سمندر کی گہرائیوں کی سی خاموشیاں اُمنڈ آئیں۔ افضل خاں نے دوائیں، دودھ اور پھلوں بھرا صندوق مزدور کے سر سے اٹھوا کر نیچے دھرا، گیس، لیمپ اور کپڑے دیئے، روپوں کی گڈی تھمائی۔ خالد کا سلام پہنچایا۔ اور ہاتھ جھاڑ کر الگ چارپائی پر بیٹھ گئے۔ شہناز اور جادوگر کی داستان پوری تفصیل سے سنائی۔ صابراں لمبی سی آہ بھر کر بولی: "چھوٹی بیگم اب اور کیا چاہتی ہے؟ کہاں تک برباد کرے گی ہمیں؟"

"اب کیا برباد کرے گی؟ اس کا آخری وار تو میں نے ٹال دیا۔"

"جمال اچھا ہو جائے تب ہے نا۔"

"ہو جائے گا اچھا۔"

"سائیں جی آپ کی بات پوری کریں۔"

"سائیں جی نے نہ کی تو خدا پوری کرے گا۔"

"کوئی بھی کرے، مجھے تو جمال واپس چاہیئے۔ جیسا یہ پہلے تھا ویسا ہی ہو جائے تو بات بنے۔"

"ہو جائے گا ویسا ہی۔"

"آج کل تو سائیں جی خفا ہیں۔ جمعرات کے جمعرات ان کے مزار پر جاتی تھی لیکن اب تو کئی دن سے وہاں نہیں جا رہی۔"

"ہوں۔"

"جمال کی بیماری نے کہیں کا نہیں رکھا۔ سوچتی ہوں سائیں جی کے مزار پر جاؤں اور کسی نہ کسی صورت جمال کو بھی ساتھ لے جاؤں۔"

یہ سنتے ہی جمال کلبلایا۔ اس نے سر اٹھایا پھٹی پھٹی آنکھوں سے بوسیدہ پٹ کھول کر میلی میلی نظروں سے پہلے فضا میں جھانکا، پھر افضل خاں اور صابراں کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ کانپے اور وہ دھیرے سے بولا: "میں سائیں جی کے پاس جاؤں گا۔"

صابراں کی باچھیں کھل گئیں۔ جمال کی اس غیر متوقع حرکت پر وہ بہت خوش ہوئی۔ جھٹ بولی، "صبح چلیں گے۔"

صابراں کی طرح عیداں بیزار بیزار سی تھی۔ جمال کی بیماری نے سارے گھر کا سکون غارت کر دیا۔ عیداں کی خوشی صابراں کی خوشی پر موقوف تھی اور صابراں کی خوشی کھنڈر ہو رہی تھی۔

جمال نے پھر سر نیچے کیا اور چپ ہو گیا۔ پھر بے دلی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ عیداں نے چیزیں سنبھالیں۔ چچا افضل خاں رخصت ہوئے۔
رات بھر چاند چمکتا رہا، روپہلی کرنیں ہوا کی موجوں اور پھولوں کی مہک سے ہم آغوش رہیں۔ صابراں تمام رات نیم جان دیئے کی طرح جلتی رہی۔ یوں تو وہ کئی رات سے سوئی نہ تھی لیکن آج کی رات تو پل بھر کو اس کی آنکھ نہ لگی جب مرغ نے فجر کی بانگ دی تو اس وقت ابھی دھرتی روشن تھی۔ آئینہ رو جھیل چمک رہی تھی۔ ہوا کی ہلکی ہلکی لہریں اس کی شفاف سطح پر بل کھا رہی تھیں۔ دور سے یوں لگتا جیسے جل پریاں کلیلیں کر رہی ہوں۔ پہاڑوں میں تابناک پھول لہک مہک رہے تھے زمین سے آسمان تک تقدس برس رہا تھا۔ صابراں بولی "کتنا اچھا وقت ہے آسانی سے رستہ کٹ جائے گا۔ اٹھو دربار چلیں!"

جمال کے بے جان ڈھانچے میں جان سی پڑ گئی۔ ایسا لگا جیسے روح جاتے جاتے پلٹ آئی ہو، سانس اکھڑتے اکھڑتے سنبھل گیا ہو، بجھتے ہوئے دیئے کی لو نے سنبھالا لیا، جمال کے سوکھے اور روکھے پھیکے ہونٹوں پر مردار سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بولا "ہاں چلو!"
وہ صابراں کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گویا گرتی ہوئی دیوار پھر سے سیدھی ہو گئی ہو۔ اس نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے بدلے، خوشبو لگائی، مالٹوں کا رس پیا، دولہا بن گیا۔ صابراں اور عیداں نے ملکر گدھے پر لاد دیا۔ پھر دونوں بہنیں اس کے دائیں بائیں ہو گئیں۔ انہوں نے مل کر سہارا دیا۔ تڑکے تڑکے یہ بارات چل دی۔

صابراں کو یقین آ گیا کہ مردہ جی اٹھے گا۔ سمجھتی تھی کہ جس طرح خود سائیں جی مر کر جی اٹھے ہیں اور عام روایت کے مطابق لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہ کر رات دن اپنے دربار میں گھومتے رہتے اسی طرح وہ اپنے معتقدوں کو بھی جلا دیتے ہیں۔ اس کے نزدیک زندہ جادوگر سے مردہ فقیر بہتر تھا۔

رستہ پہاڑیوں سے بل کھاتا جاتا۔ اگرچہ یہاں ناہمواریاں ہی ناہمواریاں تھیں لیکن خود صابراں کی زندگی میں بھی تو ناہمواریاں ہی ناہمواریاں تھیں۔ اس کے ناہمواری کا دوسرا نام زندگی تھا۔ وہ ناہمواریوں سے خوگر تھی۔ اسی لئے اسے پہاڑیوں کی ناہمواریوں کا علم نہ ہوا۔ اس کی زندگی ان ناہمواریوں سے بالاتر تھی۔ ان پیچیدہ اور ناہموار راہوں میں گدھا مثالی سواری تھا اور پھر صابراں کا گدھا تو اس رستے کا بھیدی تھا۔ بیسیوں بار سائیں جی کے مزار پر آیا۔ یوں وہ اس کے لئے مقدس اور متبرک تھا۔ اس مقدس سفر میں وہ ضرور ان کا شریک ہوتا۔ آج تو وہ خاص طور پر خوش تھا۔ یوں تیز تیز قدم اٹھائے جا رہا تھا جیسے تفریح کو نکلا ہو۔ اصل میں وہ وہ سمجھتا بیٹھا خالی ہے اس پر جو بوجھ لدا تھا وہ سراسر تکلف تھا۔ بوجھ کیا تھا، بوجھ کے نام پر تہمت تھی۔

پوری وادی پھولوں کی شاداب مہک سے معمور تھی۔ چاندنی کا روپہلی جال پھیلا ہوا تھا، تاروں کا قافلہ لٹا لٹا سا نظر آتا۔ یہ لٹا لٹا سا قافلہ صابراں کا دم ساز تھا۔ اس کی آرزوؤں کا قافلہ بھی تو لٹ رہا تھا جب سفر پہ نکلی۔ اس سے آس بندھ بندھ جاتی لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل ڈوبنے لگا۔ یوکلپٹس کے اونچے اونچے پیڑ دیکھ کر اسے بڑا دکھ ہوا۔ کتنی حسرت ٹپک رہی تھی ان سے! کتنی سنسان تھیں ان کی ڈالیاں! کتنا بھیانک تھا ان کا سایہ! جیسے ان پیڑوں میں بھوت چھپے ہوں، جیسے ان کی پھننگوں پر چڑیلیں بیٹھی ہوں۔ یوں بے کسی کے عالم میں تو وہ کبھی یہاں سے نہ گذری تھی۔ آج تو اردگرد کے پہاڑ بھی اسے ڈرا رہی تھیں۔ اور ماحول کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ اس کے اندر بہت بڑا بھنور اٹھ رہا تھا۔ اس میں آس کی ناؤ پھنس کر رہ گئی۔

عیداں کی حالت بھی غیر تھی۔ اسے بھی یوکلپٹس کے پیڑ سوتے سوتے لگ رہے تھے۔ کبھی وہ بڑے سہانے تھے۔ ان کی چھاؤں میں پیار کی گھڑیاں جوان ہوئیں۔ آج یہاں یادیں پامال ہو رہی تھیں۔ وہ کئی بار خالد کے ہمراہ ادھر سے گزری اور وادی کو جگا گئی وہ تو خیر اتنی مایوس نہ تھی اس کا پیارا زندہ تھا خالد موجود تھا لیکن صابراں کی ناؤ ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ ویسے خالد نے اسے بھی آسرا دیا۔ اس نے پورے کنبے کو

"نواب محل" میں رہنے کی دعوت دی لیکن صابراں کا جی نہ مانا۔ اس میں شک نہیں کہ "نواب محل" میں سو طرح کی راحتیں اور سہولتیں تھیں لیکن "نواب محل" میں تو شہناز بھی رہتی تھی۔ شہناز نے "نواب محل" کا تصور بہت بھیانک کر دیا۔ جہاں خالد کے "نواب محل" نے اسے ہر طرح آسرا دیا۔ وہاں شہناز کے "نواب محل" نے اسے لوٹ لیا۔ وہ تو پہلے ہی غریب تھی۔ اسے لوٹ کر "نواب محل" کو کیا ملا؟۔

صابراں کو جب کبھی اپنے اچھے دن یاد آتے تو بالکل ایسے جیسے کسی نے بستر مرگ پر سنبھالا لیا ہو، ذرا کی ذرا کے لئے اس مختصر سی یاد سے تو وہ بلکہ اور بھی دکھی ہو جاتی۔ اس کا رواں رواں تڑپنے لگتا۔ صبر کا پیالہ پئے ہوئے تھی۔ اس کی آہیں اور چیخیں راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں تھیں۔ یہ زمین اور یہ آسمان اس کی آہیں اور چیخیں سننے سے قاصر تھا۔ یوں تو وہ جمال کو سہارا دیئے ہوئے تھی لیکن دراصل امید و بیم کے طوفان میں خود ہی ہچکولے کھا رہی تھیں۔

ایک زمانے میں اس کی زندگی سراسر مسرت تھی تب "نواب محل" اس کی زندگی میں داخل نہ ہوا۔ جمال ادھر ادھر جا کر دہاڑی کرتا۔ کہیں تعمیر کا کام ہوتا تو وہ اینٹیں ڈھونے اور کیچ گارا تیار کرنے چلا جاتا۔ اور نہ ہو تو منڈی میں جا کر بوریاں اور ٹوکرے اٹھاتا۔ روز نئی نوکری ہوتی۔ روز تازہ فکر لاحق ہوتا۔ ماہ و سال دنوں میں یوں منتشر ہوتے جیسے ریت کے ذرے۔ پھر ان منتشر دنوں کی شیرازہ بندی ہوئی۔ یہ مہینوں اور سالوں کے پیمانوں میں تبدیل ہو گئے۔ تسبیح کے دانوں کی طرح دھاگوں میں پرو دئے گئے۔ اسے "نواب محل" میں مالی کی جگہ مل گئی۔ "نواب محل" کا یہ آب یارہ ایک وقت پھلواریوں میں گزارتا تو دوسرا وقت شہناز کے ایوان میں۔ یہیں سے صابراں کی مصائب کا آغاز ہوا۔ زندگی مسرت کی راہ پر چلتے چلتے اپنے آپ ہی ایک بھیانک سمت مل گئی اور اس کے اختیار میں نہ رہی۔ شہناز نے اس سے زندگی کی باگ ڈور چھین لی۔

اونچے نیچے پیڑوں کی ڈالیاں ناچتی جھومتی رہیں۔ پہاڑوں کے نشیب ستی کے عالم میں پڑے اونگھتے رہے اور ان کی کوکھ میں بہتی ہوئی ندیاں گھمبیر راگنی گاتی گنگناتی رہیں، پھولوں کی مہک اور چاندنی شیر و شکر ہوتی رہی، پہاڑوں میں گھومنے والی ہوائیں فضا میں نغمے بکھیرتی رہیں لیکن صابراں غم زدہ ہی رہی۔ کوئی دم ساز نہ ہوا۔ اس کی چیخیں اس کے دل میں بھٹکتی رہیں، اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکتے رہے۔ کوئی غمگسار نہ ہوا۔ البتہ آسمان پر اڑتی ہوئی چیلیں جو نسائی انداز کی تیکھی تانوں سے آسمان کا کلیجہ چیرتیں۔ کسی حد تک اس کے غم کی ترجمان ہوتیں۔

صابراں کبھی ایک گبھرو کی شاداب آرزو تھی۔ صابراں اور جمال کبھی ایک دوسرے کے لئے پیار کے دیوی اور دیوتا تھے، دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب تھے جیسے ہوا کی موجیں، جیسے پانی کی لہریں لیکن پھر وقت سے پہلے رُت بدل گئی۔ پیار کے تار ٹوٹ گئے۔ نغمے بکھر گئے۔ آرزوؤں کے پیالے خالی ہو گئے۔ پیار کی البیلی ندی دو پاٹوں میں بٹ گئی۔ ایک کو شہناز کاٹ کر اپنے گھر لے گئی۔ پھر یہ ندی سوکھ گئی۔

صابراں اب ضبط کی حد سے باہر ہونے لگی۔ ہولے ہولے اس کے آنسو بہنے لگے۔ وہ چپکے چپکے آہیں بھرنے لگی۔ دل میں دبی ہوئی چیخیں لرزتے ہوئے ہونٹوں پر ابھرنے لگیں۔ ان آہوں اور چیخوں میں بڑی گھمبیر تا تھی۔

دن پھوٹ پڑا۔ چاندنی رخصت ہوئی۔ مہک اکیلی رہ گئی۔ اب تثلیث کا قافلہ تنہا نہ رہا۔ ادھر ادھر کی پہاڑی بستیوں سے لوگ نکل آئے۔ چرواہے بھیڑ بکریوں کے گلے لیکر نشیب و فراز میں بکھر گئے۔ ان کی بانسریوں سے گیت کی برکھا ہونے لگی۔ سڑک پر ہجوم کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ لیکن صابراں غم کے بوجھ تلے دبی خود کو تنہا تنہا محسوس کرنے لگی۔ جمال کو دیکھ دیکھ کر وہ نڈھال ہو ہو جاتی۔ جمال مقدس گدھے پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ صابراں ایک ہاتھ سے دوپٹے کا پلو تھامے آنسو پونچھے جاتی، دوسرے ہاتھ سے وہ باز و پکڑے رہی۔ جو کبھی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند سنگین تھا اور اب خزاں رسیدہ شاخ کی مانند ناتواں۔ آنسوؤں کی ڈوری سے غم کا طوفان بندھا تھا۔

تثلیثی قافلہ چشمے کے پاس جا کر رکا۔ جہاں سائیں جی نے ایک زمانے میں چلّہ کاٹا تھا۔ مشہور تھا کہ انہی کے حکم سے یہاں چشمہ پھوٹا۔ سینہ بہ سینہ یہ روایت چلی آئی کہ ایام ریاضت میں ایک گڈریا صبح و شام دو وقت سائیں جی کو دودھ پلا کر جاتا ایک روز گڈریا نہ آیا۔

دن بھر تو سائیں جی کا روزہ رہا۔ افطار کے وقت بُرا حال ہوا چنانچہ سائیں جی نے جلال میں آکر چٹان پر پاؤں دے مارا پتھر شق ہوگیا اور شیریں پانی بہہ نکلا۔ تب سے یہ جگہ متبرک قرار پائی۔ ہر زائر یہاں رُکتا اور از راہِ تبرک چشمے کا پانی پیتا۔ یہ لوگ بھی دم لینے کو ٹھہر گئے۔ انہوں نے پانی پیا۔ گدھے نے بھی پیٹ بھر لیا۔ جمال لیٹ رہا۔ صابراں اور عیداں نے اسے دابا۔ تھکن دور ہوئی تو قافلہ پھر رواں ہوا۔

آخر سائیں بادشاہ کے سبز گنبد کا سنہری کلس نظر آیا۔ جو کرن کی طرح چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر جمال کے چہرے پر رونق سی آگئی۔ اس گمشدہ کیفیت کو پاکر صابراں کے دل کا کنول کھِل گیا اسے تو گویا وہ جمال مل گیا جو برسوں سے گم تھا۔ اس کے آنسو تھم گئے اور جذبات کا طوفان سمٹ کر دل کی تہہ میں بیٹھ گیا۔ جمال یوں تازہ دم ہوگیا جیسے نشوں کی ساری سمّیت دھواں بن کر فضا میں اڑ گئی۔ جب اس نے کمر سیدھی کی تو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے شہناز بھی دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہوگئی ہو۔

صابراں نے مسکرا کر کہا "سائیں بادشاہ کے کیا کہنے! بڑی کرامات والے ہیں۔"

"ہاں۔"

"آخر چھوٹی بیگم کا جادو رہ گیا۔"

"ہاں۔"

"چھوٹی بیگم برباد ہو کر رہے گی۔"

"کم ذات جلدی برباد ہو۔"

"جلدی برباد ہوگی۔"

"سائیں بادشاہ کے واری واری جاؤں۔ اٹھنے تک کی ہمت نہ تھی۔ اور وہ مجھے یہاں تک کھینچ لائے۔"

"اب آپ اچھے ہو جائیں گے۔"

"سائیں بادشاہ ہی اچھا کریں تو کریں۔"

"ضرور کریں گے۔ ہم تو ان کے نوکر ہیں۔"

اب کلس کے ساتھ گنبد اور بڑا پھاٹک بھی دکھائی دیا۔ یہیں سے آرزوؤں کے قافلے گزرتے اور شہرِ امید میں داخل ہوتے۔ چاروں طرف قدِ آدم فصیل تھی۔ سامنے سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں کے پاس پہنچے تو جمال معمولی سے سہارے سے نیچے اتر آیا۔ پھر اس نے ڈوبتی ہوئی نظروں سے صابراں کو دیکھا تو صابراں کا دل بھر آیا۔ تھوڑی دیر پہلے طوفان تھما اور آنسوؤں کا سیل یوں رکا جیسے کوئی لشکر قلعہ گیر ہوا ہو۔ اسکی آنکھوں کے کنارے سوکھ رہے تھے لیکن ضبط کی ڈوری ہاتھ سے چھوٹی تو پھر جھڑی لگ گئی اور اب تو اس کی چیخیں بھی نکل گئیں۔

"یہاں نہیں روتے صابراں!" جمال نے تسلی دینے کی غرض سے ناتواں آواز میں کہا "یہ سائیں بادشاہ کا مزار ہے۔ ہم یہاں دکھڑا رونے نہیں آئے۔ سائیں بادشاہ تو آپ ہی دلوں کا حال جانتے ہیں۔"

لیکن صابراں نے جانے اس کی آنکھوں میں کیا دیکھا کہ نہ آنسوؤں کی جھڑی تھمی اور نہ چیخیں رکیں۔

صابراں روتی گئی اور وہ ٹیکا لگا کر زینے پر بیٹھا رہا۔ زائرین دائیں بائیں سے گزرتے رہے۔ کون جانے ان میں کون کون جمال تھا اور کون کون صابراں تھی۔ ایک ہجوم تھا کہ اجڑے دیار سے لٹ پٹ کر آیا۔

عیداں گدھے کو پیڑ سے باندھ کر آئی تو افسردگی کی تصویر بن کر پاس کھڑی ہو رہی۔ اس تصویر کی افسردگی میں کون شریک ہوتا۔ لیکن ہر زائر اسے دیکھ کر ٹھٹکتا اور پھر آگے بڑھتا۔

جب اس نے دیکھا کہ صابراں کی چیخیں تھمتی ہی نہیں تو اس نے مزید انتظار نہ کیا۔ عیداں کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ آخر صابراں بھی ساتھ ہو لی اور اس نے بھی اپنا شانہ آگے کر دیا۔ یہ لوگ سیڑھیاں چڑھ کر پھاٹک پر پہنچے اور آرزوؤں کے کارواں کے ساتھ شہر امید میں داخل ہو گئے۔ کشادہ صحن میں زائرین پھیلے ہوئے تھے۔ فرش تپ رہا تھا۔ جگہ جگہ ٹاٹ کے راستے بچھے ہوئے تھے۔ بہشتی وقفے وقفے کے بعد ان پر چھڑکاؤ کرتے۔ زائرین انہیں پر چلتے۔

صابراں کی چیخیں جاری رہیں تو جمال نے پھر کہا "چپ ہو جاؤ صابراں! بزرگ کے پاس آ کر نہیں روتے، بے ادبی ہوتی ہے۔"

لیکن صابراں کو تو جیسے آج ہی رونے کا موقعہ ملا تھا۔ وہ تو جیسے اپنے آپ کو آنسوؤں اور چیخوں میں تبدیل کر رہی تھی۔ وہ روئے جا رہی تھی اور گرد و پیش کے زائرین کا دل گداز ہو رہا تھا لیکن پھر جانے کیا ہوا؟ مرمریں تعویز دیکھتے ہی اس کی چیخیں ایکدم تھم گئیں۔ یوں ہوا جیسے بادرفتار گاڑی کو خود کار بریک لگ گئے ہوں۔ جمال اور زائرین حیران رہ گئے۔

مزار پر پہنچ کر جمال نے آستانے پر بوسہ دیا۔ اب وہ بے سہارا چلنے لگا۔ اس نے تین بار روضے کا طواف کیا اور پھر تربت شریف کے سرہانے کی جالی سے لگ کر بیٹھ رہا۔ صابراں اور عیداں بھی پاس ہی بیٹھ گئیں۔

ادھر آنگن کے ایک گوشے میں قوالوں نے محفل جمائی۔ ادھر انہوں نے آواز اٹھائی اور ادھر جمال سجدے میں چلا گیا۔

سفید ریش حافظ جی دستار فضیلت باندھے اور جبہ پہنے چٹائی پر بیٹھ گئے اور کلام پاک کی تلاوت کرنے لگے۔ ان کی خوش الحانی سے متاثر ہو کر چند عورتیں "سبحان اللہ، سبحان اللہ" کہنے لگیں۔ کئی مرد اور عورتیں سپارے لے کر پڑھنے لگی تھیں۔ کتنے ہی زائرین اوراد اور وظائف میں مشغول تھے۔ ایک درویش گز دو گز لمبی تسبیح بکھرے دانے پھسلانے اور کلام پڑھے جا رہے تھے۔ ایک بزرگ کھجور کی گٹھلیوں کا ڈھیر لگائے بیٹھے تھے۔ زیر لب کلام پڑھتے جاتے اور گٹھلیاں اٹھا اٹھا کر تھیلیا میں رکھتے جاتے۔ ایک ملنگ ادھر ادھر ٹہل رہا تھا اور الا اللہ کے نعرے لگا رہا تھا۔ بیشتر لوگ اس کی طرف متوجہ تھے اور دین متین کا یہ شارٹ کٹ کافی دلچسپی کا باعث بنا ہوا تھا۔ عورتیں روضے کی جالی کے سوراخوں سے رنگ برنگ کی اٹی کے دھاگے باندھ رہی تھیں۔ جالی میں جگہ جگہ مرادیں، تمنائیں اور آرزوئیں بندھی تھیں۔ ہفت رنگ دھاگوں کے ساتھ پلاؤ زردے کی دیگوں کو بھی گرہ دے دی گئی۔

زائرین ہار پھول بھرے دونے لیکر آتے اور اپنی تمناؤں کے ساتھ انہیں تربت پر بکھیر دیتے۔ شام تک آرزوؤں اور پھولوں کے انبار لگ جاتے۔ اور دور دور تک مہک جاتی۔ رات گئے ایک گندھی آتا۔ پھول اٹھا کر لے جاتا اور آرزوؤں کو وہیں بھٹکتا چھوڑ جاتا۔

آستانے کے سامنے چبوترے پر ہیڈ مجاور نذر و نیاز کے چاول، بتاشے، مکھانے اور پھل مٹھائیاں لے لے کر بڑے ٹوکرے میں رکھتا جاتا۔ ہر زائر جانے سے پہلے تبرک بھی لیتا۔

مزار کے مشرق میں آنگن کا ایک حصہ منڈیروں سے محصور کر کے کبوتروں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ جو ہر وقت غٹر غوں کرتے اور منڈیر کے بیرونی حصے سے کم ہی علاقہ رکھتے۔ یہ ان کا گھر تھا۔ یہاں سے اڑتے تو گنبد پر جا بیٹھتے اور وہاں سے اڑتے تو یہاں آ بیٹھتے۔ فضا ہر وقت پھڑ پھڑاتی رہتی۔ ان کا یہ تانا بانا ایک نوع کی ریاضت تھا اور غٹر غوں تو بالکل ایسی تھی جیسے وہ ورد کر رہے ہوں۔ مرتاض کبوتروں کی یہ چلہ کشی زائرین کو متاثر کرتی۔ سائیں کے یہ عاشق اس بلا کے متوکل تھے کہ در بار چھوڑ کر نہ جاتے۔ یہیں ان کے رزق کا اہتمام تھا۔ چھوٹے مجاور نے اٹھ کر پانی کا برتن بھرا اور چلمچی میں دانہ ڈالا۔ پھر جھاڑو لیکر صفائی کو نکلا۔ عاشقوں کے ایک جوڑے نے پچھلی رات جام شہادت نوش کیا۔ چھوٹے مجاور نے اسے اٹھا کر گھوڑی پر پھینکا۔ جہاں خالی دونے، کاغذ کے تھیلے، پھلوں کے چھلکے اور مٹی کے ٹوٹے پھوٹے دیئے پڑے تھے۔ چھوٹے مجاور نے کھجور کے لمبے جھاڑو سے آنگن صاف کرتے ہوئے جمال کو دیکھا جو سجدے میں پڑا تھا بولا "یہ جو سچے دل سے بزرگوں سے لو لگائے۔

اس کے کام نہیں اٹکتے"

ادھر ہر زائر کی زبان رواں تھی۔ کوئی نامعلوم خلاؤں میں خداؤں کو ڈھونڈ رہا تھا اور دل کی دھڑکن سننے سے قاصر تھا۔ کسی نے اپنا ایمان سائیں کی لحد پر چپت کر دیا، اسے مٹی میں حاجت روا ملا۔ کسی کے لئے تربت زینہ تھی جس پر چڑھ کر وہ آسمان پر وہاں پہنچ سکتا جہاں اسکے خیال میں خدا کا مسکن تھا۔ کوئی لڑکی کے پیار سے دل کا کٹورا لبریز کئے ہوئے تھا۔ اور اس کٹورے میں کچھ سما ہی نہ سکتا۔ صابراں کیلئے تو سائیں ہی سچا سائیں تھا۔ اس کا دل کہتا کہ سائیں جی اس وقت بھی زائرین میں گھوم رہے ہیں اور ہر ایک کی آواز سُن رہے ہیں۔ وہ ہر کسی کا دل ٹٹول لیتے ہیں۔

ساری فضا وردوں وظیفوں، مرادوں اور دعاؤں کے شور سے گونج رہی تھی۔ اس گونج میں وہی گھمبیرتا تھی جو ساگر راگ میں ہوتی ہے۔

ایسے میں جمال کی چپ بڑی انوکھی اور پُر اسرار لگتی۔ وہ کچھ اس انداز سے سجدے میں پڑا تھا جیسے بات منوا کر ہی سر اٹھائے گا۔ اسے اسوقت دنیا و مافیہا کی شمہ بھر پروا نہ تھی۔ کون جانے اس کے ہونٹوں سے کون سی دعا، کونسی تمنا، کونسی مراد پھسلی اور فضا میں گم ہو گئی؟ کسی نے کچھ نہ سُنا۔ پاس بیٹھی ہوئی صابراں اور عیداں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

کبوتروں کا گھر صاف کر کے چھوٹا مجاور صابراں کے پاس آیا اور اس نے پوچھا "بھائی جی کو کیا تکلیف ہے آپا جی؟ بڑے دبلے ہو رہے ہیں"

"کسی نے جادو کر دیا ہے"

"جادو! پھر تو بھائی جی ٹھیک ہو جائیں گے۔ سائیں جی سے کالے علم والوں کی تو جان جاتی تھی"

حافظ جی نے دو سپارے تمام کئے، لمبی تسبیح والے درویش نے درود اور کبوتروں نے دانے کی آدھی چلچی، الا اللہ کے نعرے لگانے والے ملنگ نے پہلی ٹانگ اٹھائی اور دوسری پر کھڑا ہو گیا۔ میر مجاور کا ٹوکرا تبرک سے بھر گیا لیکن جمال کا سجدہ ادا نہ ہوا وہ یونہی روضے کی جالی کے سامنے مسجود رہا۔ آخر صابراں نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی لیکن وہ نہ بولا اور نہ ٹس سے مس ہوا۔

اب تو صابراں نے اسے بازو سے پکڑ کر ہلایا۔ ٹھنڈا ڈھانچہ اس کے زانوؤں میں آگرا۔ جمال کی آنکھیں یوں بند تھیں۔ جیسے گہری نیند میں ہو۔ صابراں نے اس زور کی چیخ ماری کہ زائرین کے دل دہل گئے اور کہرام مچ گیا۔ پاس کے کبوتر گھبرا کر اڑ گئے۔ قوالوں نے لَے تیز کر دی۔ ملنگ نے زیادہ جذبے سے الا اللہ کے نعرے لگائے۔ حافظ جی لپک کر آئے، جبہ سمیٹ کر انہوں نے نبض پر ہاتھ دھرا۔ اور پھر انا للہ و انا الیہ راجعون کہہ کر جبہ پھڑ پھڑاتے پلٹ گئے انہوں نے برابر والے سے کہا "خبر نہ ہوئی۔ ورنہ میں سورہ یٰسین ہی پڑھ دیتا"

"خیر مرنے والے کو مرنا تھا سو مر گیا"

عورتیں اور مرد ارد گرد جمع ہو گئے۔ سجادہ نشین چبوترے سے اٹھ کر آیا اور صابراں کو تسلی دیتے ہوئے بولا "بیٹی! خدا کے کاموں میں کسی کا دخل نہیں۔ بزرگوں کے قدموں میں جان دینے والا جنتی ہوتا ہے۔ صبر سے کام لو!"

زیر گنبد ازلی ابدی خاموشی مسلط تھی۔ اوراد و وظائف کا شور بڑھ گیا۔ آنگن میں دھوپ پوری تیزی سے چمکنے لگی۔ کبوتروں کی غٹر غوں جاری رہی۔ قوالوں نے بڑے جذبے سے آواز اٹھائی۔ یوں لگا جیسے سارا دربار بین کر رہا ہو، پوری کائنات لٹ گئی ہو لیکن صابراں کی آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکا۔

کسی نے چپکے سے کہا "یہ شہید ہے۔ اسے یہیں دفنایا جائے"

ہماری نئی کتابیں

انتخاب داغ
بابائے اردو مولوی عبدالحق

نواب مرزا داغ اپنی پرشوخ شاعری اور ستھری زبان میں جواب نہیں رکھتے۔ رندانہ شوخی اور سرمستی کا دلکش مرقع اس انتخاب میں کلام داغ کی روح کھینچ کر آگئی ہے بابائے اردو کے گرانقدر مقدمے کے ساتھ۔

قیمت:۔ چار روپے

ادب اور شعور
ممتاز حسین

دور حاضر کے نہایت باشعور ناقد کی تنقیدات عالیہ ادب اور تنقید ایک نہایت پرخار وادی ہے ممتاز حسین اس پرخار وادی میں نہایت دلّانہ داخل ہوئے اور بہتوں کے لئے جرأت اور بے باکی کی ترغیب کا سبب بن گئے۔

قیمت۔ دس روپے

تذکرہ جگر مرادآبادی
محمود علی خاں جامعی

جگر ایک دوست بمصنف ناقد اور سخن فہم کی نظر میں خلوت سے جلوت تک۔ دیکھا جگر کو خلوت و جلوت میں بارہا اور اس نچوڑ کو اس کتاب میں محفوظ کر دیا قیمت ۴/۲۵

دیوان خواجہ میر درد
اردو کا سراپا انتخاب دیوان

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر ہیں میر تقی میر درد اور سودا اردو غزل کی زریں مثلث کے تین زاویے ہیں۔ ان کا دیوان سراپا انتخاب ہے اس باب میں اردو شاعری کی تاریخ میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے

حالی اور نیا تنقیدی شعور
پروفیسر اختر انصاری دہلوی

تنقیدی ادب کے ہاتھ میں ایک نئی مشعل اردو ادب میں حالی جس منصب اور اعزاز کے مستحق تھے۔ انہیں اس پر متمکن نہیں کیا گیا۔ حالی پر بہت کچھ لکھنے کی ضرورت تھی۔ پروفیسر اختر انصاری دہلوی نے حالی کو اپنے نئے تنقیدی شعور کی روشنی میں دیکھا اور دکھایا ہے۔

قیمت:۔ ایک روپیہ ۵۰ پیسے

روح اور فلسفہ
سید محمد تقی

روح ہو یا فلسفہ دونوں ہی دشوار گزار گھاٹیاں ہیں اور جب یہ دونوں ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں تو بات اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہے۔

سید محمد تقی نے ان دونوں کو جس طرح اس کتاب میں سمو دیا ہے یہ انہی کا کام تھا۔

قیمت:۔ ۱۰ روپے ۵۰ پیسے

روح جاوداں
علامہ ثاقب کانپوری

ثاقب نے اس گئے گزرے دور میں نہ صرف تغزل کی روح کو برقرار رکھا ہی بلکہ اسکے ساتھ ہی حالات اور وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات اور تقاضوں کا بھی پوری طرح ساتھ دیا ہے۔ قیمت۔ تین روپے

گلنار
ناول
بدر شکیب

حیرت، اسرار اور تجسس سے لبریز ناول ایک جبلی انسان جس نے انسانی روح اور زندگی کو تعالی اور کیمیائی انداز میں جنم دینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا ایک ناکام محبت اور ضدی انسان کا اپنے رقیب اور دشمنوں سے خوفناک انتقام۔ قیمت پانچ روپے

اردو صرف و نحو
مولوی عبدالحق

کسی بھی زبان کی عمارت کی تعمیر اس کی اپنی صرف و نحو پہ ہوتی ہے۔

بابائے اردو نے اردو صرف و نحو لکھ کر اس کی بنیاد کو اور زیادہ مستحکم اور مضبوط کر دیا ہے۔

قیمت:۔ تین روپے

اردو مرکز
گنپت روڈ۔ لاہور

اردو اکیڈمی سندھ
بندر روڈ۔ کراچی

کتاب ایجنسی
تلک چاڑی۔ حیدرآباد

ٹھاکر پونچھی

ساقی (کراچی)

خوشبو کی قوت

جب بدلیوں نے سارے آسمان کو گھیر لیا اور تارے اندھیروں میں گم ہو گئے۔ تو پیارے لال نے اپنی برساتی کی دونوں کھڑکیاں بند کر لیں اور تاریکی میں اپنی یادوں کی شمعیں روشن کرنے لگا۔ جو اس سیاہ سناٹے کا واحد حل تھیں۔ اس کے خیال میں ارد گرد مدتوں سے پھیلا ہوا اندھیرا بجلی کے قمقموں سے مٹنے والا نہ تھا۔ وہ روح کا اندھیرا تھا۔ جو پیدائش کے وقت سے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ پل بھر کے لئے بھی جدا نہ ہوا۔ حتیٰ کہ تین منزلہ عمارت کی برساتی تنگ و مشکل اونچائی بھی راستہ نہ روک سکی تھی۔ جہاں وہ پورے دس برس سے رہ رہا تھا۔ جہاں اس کی جوانی کا احساس ہمیشہ کے لئے مر گیا تھا۔ ہمیشہ سیڑھیاں چڑھتے اترتے اب اس کا دم بھی پھولنے لگا تھا۔ جہاں اس نے کئی بار ایک حسین سی عورت کو اپنانے کی کوشش کی تھی ہر بار ناکام رہا۔ اب تک زندہ تھا۔ اس لئے نہیں کہ اُسے اپنی زندگی سے پیار تھا۔ بلکہ اس لئے کہ موت بیوی کا لبادہ پہن کر نہیں آ رہی تھی۔ محبوبہ کے لباس میں آتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ موت بیوی بن کر اس سے لپٹ جائے۔ وہ محبوبہ بن کے گلے لگنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی زندگی نہ بیوی بنی اور نہ موت ہی۔

پیارے لال کی زندگی ایک خاص عمر تک پیار کے جھنجھٹ سے بالکل کوری رہی۔ پیار کی جتنی چھوٹی بڑی بنیادی قسمیں تھیں ان سے بالکل بے بہرہ تھا۔ ماں باپ، بھائی بہن، عزیز و اقارب کا پیار لگاؤ اور یہ مرئی غیر مرئی جذبہ اس کے لئے اجنبی تھا۔ اس سے کسی نے پیار نہ کیا تھا۔ اس نے ایک خاص عمر میں پیار کی بھیک مانگی۔ کشکول اٹھائے در در پھرتا رہا۔ دوگنے پیار کے بدلے آدھے پیار کی بھیک مانگی۔ کسی نے دلچسپی نہ لی۔ اسکول اور کالج کا اپنا زمانہ دونوں ہاتھوں سے دوسروں پر لٹایا۔ رنگین جوان بخت لمحے اپنے دوستوں پر صرف کر دیئے۔ اس کی کتابیں پارچاجات روپیہ اور دیگر چیزیں دوستوں کے لئے تھیں۔ واقف کاروں کے لئے تھیں۔ خود بھوکا ننگا رہتا۔ لیکن دوسروں کی ضروریات پوری کرتا۔ جان کی بازی لگا دیتا۔ اس کے بل بوتے پر ساتھی محبت کی پینگیں بڑھاتے۔ لیکن بلند و بالا پیڑوں پر پینگ کی رسی پیارے لال ہی باندھتا۔ جب محبت کی پینگیں عرش کی بلندیوں کو چھونے لگتیں۔ تو اس کا بھی دل چاہتا۔ پینگ بڑھائے اور آسمان کی نورانی وسعتوں کو پالے۔ جہاں چاروں طرف قسم قسم کا پیار بکھرا پڑا تھا۔ جہاں چاروں طرف قسم قسم کے پھول کھلتے تارے ہی تارے ..... اور اپنی جوانی کی محبت کو اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے روشناس کروا دے اور پھر کبھی انجانی بلندیوں سے اپنی ان جانی پہچانی پستیوں میں نہ آئے۔ لیکن کسی نے اس کے لئے کسی درخت سے ریشمی رسی نہ باندھی۔ کسی نے اسے پینگ بڑھانے کی دعوت نہ دی۔ وہ اپنی زندگی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں کی طرح ایک لمبا

مضبوط رسے کر درختوں کی چھاؤں میں خاموش کھڑا رہا تاکہ کوئی ساتھی ملے اور وہ اشارہ پاتے ہی جان کی بازی اب کی بار اپنے لئے لگا دے۔ کوئی اشارہ نہ ملا۔ آج تک کوئی نہیں۔

زندگی محبوبہ کا لباس پہنے بیٹھی رہی۔

موت محبوبہ کا لبادہ اوڑھے کھڑی رہی۔

اسے اپنے مستقبل کیلئے صرف بیوی کی ضرورت تھی۔ پیار محبت کی راہوں پر چلتے ایک دن پوچھ بیٹھتا۔

"آؤ اب بیاہ رچالیں!"

ہاتھ سے ہاتھ چھوٹ جاتا۔ راہیں سونی ہو جاتیں۔ وہ عارضی وقتی رشتوں کی دنیا تھی۔ وہ ابدی مستقل سہاروں کا قائل تھا۔ اسے کوئی سہارا نہ ملا۔ آج تک نہیں!۔

جب بدلیاں سارے آسمان کو گھیر لیتیں اور ستارے اندھیروں میں گم ہو جاتے۔ تو اسے اپنی زندگی کا ایک روشن ستارہ ذہن کے کسی سوتے ہوئے گوشے میں ٹمٹماتا دکھائی دیتا۔ اور مولیناں کا دھندلا مٹیالا نقش آنکھوں کے سامنے جاگ اٹھتا۔ اور اس کی پیشانی کے زخم ہرے ہو جاتے اور وہ غیر شعوری طور پر اپنے پرانے زخموں کو سہلانے لگتا۔ جو اس کی سوچوں نے وجود پر لگائے تھے۔ اسے محسوس ہونے لگتا جیسے مولیناں اپنی طنز بھری مسکراہٹ اپنے نیم یاقوتی ہونٹوں پر اچھال اچھال کر اپنی میٹھی باتیں دُہرا رہی ہو۔

"پیارے۔ تم کھل کر بات نہیں کر سکتا۔ محبت کیسے کرے گا۔ محبت نہیں کرے گا تو مجھے اپنی بیوی کیسے بنانے گا؟"

"میڈم مولیناں:" وہ اپنی کمزوریوں کو بڑے معصومانہ انداز سے مولیناں کے سامنے بکھیرتے ہوئے جواب دیتا: "میں اس شکار گاہ میں بالکل اناڑی ہوں شکست خوردہ ہوں مجھے وقت دو۔ میں سب سیکھ جاؤں گا۔ پہلے بھی میں نے سیکھنا چاہا۔ کسی نے وقت نہ دیا۔"

"خاک سیکھے گا" مولیناں جل کر کہتی: "تین مہینے ہو گئے صبح شام ملتے۔ تم نے کبھی کوئی شعر نہیں گنگنایا۔ میرے قریب بیٹھ کر کبھی گھور کر نہیں دیکھا۔ ٹھنڈی سرد آہیں نہیں بھریں۔ کبھی کوئی فلمی گیت نہیں گایا۔ خالی خولی ہاتھ ملتا ہے۔ خالی خولی جیبوں کو ٹٹولتا ہے کیسے سمجھوں۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتے ہو؟"

"دیکھو مولیناں:" وہ بڑی قناعت سے جواب دیتا: "میں تمہیں اپنے دل سے چاہتا ہوں۔ جو کوئی کسی کو اپنے دل سے چاہتا ہے۔ اس کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ صرف دھڑکنیں اس کے دل کا حال بیان کرتی ہیں۔ کان لگاؤ میرے دل کے ساتھ۔ تمہاری ان باتوں سے کیسے ڈوب ڈوب کر دھڑک رہا ہے۔ اور پھر تم نے وہ شعر نہیں سُنا۔ لبوں پہ مُہرِ خاموشی، دلوں ۔ ۔ ۔"

"بڑا پھُس پھُسا شعر ہے۔ اگلے وقتوں کے محبت کرنے والوں کا شعر ہے:" وہ سگریٹ کا دُھواں نکلتے ہوئے جواب دیتی: "کوئی رومانٹک شعر بولو۔ ایک دم رومانٹک۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ آجکل کی صحبت میں زبان کیسے بڑھ چڑھ کر چلتی ہے۔ میں نے صرف ایک بار پہلے محبت کی ہے۔ بڑا خوبصورت تھا۔ بڑی بڑی باتیں کرتا تھا۔ نشہ آجاتا تھا۔ وہ نثر نہیں بولتا تھا۔ ایک دم پوئٹری میں بات کرتا تھا۔ سالا مجھے دھوکہ دے گیا۔ شوہر بننے کا وقت آیا۔ بھاگ گیا۔ ٹینی سن اور شیلے کا شیدائی تھا۔ بھاگ گیا۔ اسے وقتی محبوبہ کی تلاش تھی۔ بیوی کی نہیں۔ لیکن تھا بڑے مزے کا آدمی۔ بالکل جان ہیگ کے پیگ کی طرح"

"میڈم۔ میں ٹھرا ضرور ہوں۔ لیکن مستقل نشہ دینے والا ہوں۔ میں دوستی کے لئے تم سے پیار نہیں کرتا۔ بیوی بنانے کے لئے پیار کرتا ہوں۔ اور پھر ۔ ۔ ۔"

مولیناں اس کے کھوکھلے ڈھانچے اور کھوکھلی جیبوں پر نظریں جماتے ہوئے جل کر کہتی۔

"میں نے کہہ دیا پیارے محبت کرنا سیکھو۔ محبت کی باتیں اپناؤ۔ پھر مجھ سے ملنا۔ خواہ مخواہ میرا ٹائم خراب کرتا ہے۔ مجھے وہی لڑکے اچھے لگتے ہیں۔ جو چرب زبان ہوں۔ خاموش ہونٹ مجھے پسند نہیں۔ تم ایک دم پتھر کے بُت ہو۔ تمہیں اپنا شوہر کون بنائے گا"

پتھر کا بُت بولتا۔

"اچھا مولیناں۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ محبت کی باتیں کرنا سیکھوں گا۔ سیکھ کر آؤں گا۔ اگر تم نے مجھے ٹھکرایا تو خودکشی کر لوں گا۔ گاڑی کے نیچے کٹ کر مرجاؤں گا۔ جو زندگی اتنی محبت سے تم نے دی ہے۔ اسے خاک میں ملا دوں گا" مولیناں نے تالی بجائی۔

"بس پندرہ دن یا مہینہ اور ایسی ہی ریہرسل کرے گا۔ سیکھ جائے گا"

مولیناں تیسری لڑکی تھی۔ جس کے ساتھ آخری مکالمہ بولنے کی نوبت آئی تھی۔ دو بار پہلے بھی وہ یہی جملہ دہرا چکا تھا۔ دو بار پہلے بھی وہ خودکشی کرنے گھر سے نکلا تھا۔ راستے میں ہی کسی سے ٹکرا گیا۔ چکر کھایا۔ وہیں گر گیا۔ کسی نے اٹھایا۔ ہاتھ تھاما۔ زخم مندمل ہونے لگا و ھتکار دیا۔ زخم کی طرح ساتھ بھی وقتی نکلا۔ لیکن مولیناں پہلی لڑکی تھی جو جسمانی طور پر اس کے اتنے قریب آئی تھی۔ محبت اور پیار سے پیش آئی تھی۔ روز صبح سویرے ہسپتال میں چلی آتی۔ اس کے ہاتھ میں سفید پھولوں کا گلدستہ تھما کر کہتی "پیارے۔ یہ تمہارے لئے ہیں" اور وہ اپنی پیشانی پر دوسری چوٹ کے زخموں کو سہلاتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے پوچھتا "اور کتنے دن اس وارڈ میں رہوں گا؟"

وہ ہنس کر جواب دیتی "یہی ہفتہ دس دن اور"

وہ چلی جاتی۔ وہ اپنے دوسرے زخم کو دیکھتا اور سوچتا۔ کیا یہ زخم گہرا نہیں ہو سکتا۔ ناسور نہیں بن سکتا۔ یہ رستا ہے۔ مولیناں سفید پھولوں کے گلدستے لاتی رہے اور اس سے کہتی رہے "پیارے۔ یہ تمہارے لئے لائی ہوں!"

لیکن زخم ہرا تھا۔ معمولی حادثے کا معمولی سا زخم تھا۔ لیکن جو زخم مولیناں نے گلدستوں سے لگائے تھے۔ وہ گہرے تھے۔ گہرے اور اذیت ناک اور رِستے ہوتے ہوئے بھی اس نے بھرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ البتہ کبھی کبھی اس پر نمک ضرور چھڑک جاتی مگر وہ ہر انداز سے بے انتہا محبت کرتا رہا۔ اسے اپنی بیوی بنانے کی تمنا کرتا رہا۔ اُسے پانے کے لئے ان راہوں کو بھی اپنا لیا۔ جو اس کے لئے اجنبی تھیں۔

مولیناں ایک نیم دیسی نیم ولایتی لڑکی تھی جسے باتیں پسند تھیں۔ اچھا لباس پسند تھا۔ ولائتی شراب اور دیسی لوگ پسند تھے۔ یہی کوئی بیس بائیس کے لگ بھگ تھی۔ زرد چہرہ اور نازک سا جسم۔ اس نے صرف ایک سے محبت کی تھی اور وہ دھوکا دے کر چلا گیا تھا۔ پیارے لال اس کے لئے صرف ایک کھلونا تھا۔ صرف اپنی پہلی سچی حقیقی محبت کی دردناک یاد مٹانے کے لئے پیارے لال کے پاس محبت کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ چھوٹے سے کام کی چھوٹی سی تنخواہ تھی۔ جس سے پیٹ بھر سکتا تھا نہ محبت کی جا سکتی تھی۔ حالانکہ اس کے اردگرد دن دہاڑے سر بازار ہی محبت کی جاتی تھی قیمت ڈال کر محبت کا وجود خرید لیا جاتا تھا۔ وہ سودے ہوتے دیکھتا۔ مال الٹتے دیکھتا۔ لیکن بے زبان جانور کی طرح کسی سے کچھ نہ مانگتا۔ پہلے اُن موقعوں پر اس کا شدید دورہ پڑتا۔ رو رو کر راتیں بسر کرتا۔ لیکن اب وہ اپنے لئے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اسے کوئی بھی سہارا نہ ملتا۔ اس کی کسی کو ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ اب اس کا دل بجھ گیا تھا۔ آنکھوں کے سوتے ہی سوکھ گئے تھے۔ وہ گھر سے خودکشی کرنے نکلا تھا۔ مولیناں سے ٹکرا گیا۔ سفید پھولوں کا ایک گلدستہ تھی۔ وہ اس گلدستے کی بناوٹ میں کھو گیا۔

اس نے پورے تین مہینے مولیناں کے ساتھ گزارے۔ مولیناں اسے بناتی رہی۔ دل بہلاوے کے لئے اپناتی رہی۔ پیارے لال کی کئی مہینوں کی کمائی نکل چکی تھی۔ لیکن حقیقی پیار کی ایک چھٹانک دھول بھی نہ ملی۔ وہ اسے اپنی بیوی بنانے کا خواہاں تھا۔ اس کی آنکھوں میں اسے اپنی بیوی کے خدوخال دکھائی دیتے تھے۔ وہ ہر قیمت پر اسے اپنا بنانا چاہتا تھا۔ اس نے دل و جان سے ریہرسل شروع کر دی ٹینی سن اور شیلے کے عمدہ عمدہ فقرے گھول کر پی لئے۔ دن رات رومانٹک شعر ڈھونڈ ڈھونڈ چھان کر یاد کرتا رہا۔ پورا ایک مہینہ مولیناں کا منہ نہ دیکھا۔ صرف

اس کی ضرورت پوری کرتا رہا جس کا اب وہ عادی سا بن چکا تھا۔
اور پھر ایک شام سج دھج کر شوہر کا امتحان دینے نکل پڑا۔ پاس ہونے میں بیوی کا ہاتھ آ مل سکتا تھا۔ فیل ہونے پر خودکشی کی تیسری اڑان۔ ولائتی شراب کا نیا نیا نشہ تھا ٹینی سن اور شیلے کے نئے نئے فقرے اور مولیناں کو اپنی رفیقۂ حیات بنانے کا عشق۔ پیارے لال پیار میں سرشار اپنی مولیناں کے گھر جا رہا تھا۔ ایک دُولہا سا بنا۔ امتحان میں پاس ہو کر اسی رات شادی کرنا چاہتا تھا۔ اپنا گھر آباد کرکے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جانا چاہتا تھا۔
دوڑتے ہوئے مولیناں کے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھیں۔ کمرہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دروازے سے کان لگائے۔ مولیناں آگ اُگل رہی تھی۔
"میں نے تم سے سچا پیار کیا۔ لیکن تم نے مجھے دھوکا دیا۔ میں تمہارا منہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ ایک دم کمرے سے باہر نکل جاؤ۔"
"یہ ٹھیک ہے میں نے تمہیں دھوکا دیا۔ لیکن غلطی بھی تو ہمارے جیسے انسان کرتے ہیں۔ سچ مانو مولیناں تم سے دور رہ کر میں نے تمہاری حقیقی قدر و قیمت جانی۔ دونوں کے لئے یہ وقتی جدائی کارآمد ثابت ہوئی۔ اب مجھے یقین ہو گیا۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"
کسی مرد کی آواز تھی۔
مولیناں دوبارہ چیخی۔
"لیکن اب مجھے یقین ہو گیا۔ میں تمہارے بغیر زندہ رہ سکتی ہوں۔ شادی کر سکتی ہوں۔"
"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں مجھ سے اب پہلی سی محبت نہیں۔ وہ عشق نہیں۔ جس کے لئے تم تڑپا کرتی تھیں۔"
"نہیں۔"
"کیوں۔"
"بس نہیں ہے۔ میں نے کتنی مدت تک تمہاری یاد کو اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ ایک شریف لڑکے کو بے وقوف بنایا۔ میں اس سے جھوٹا پیار کرتی رہی۔ ڈانٹتی رہی۔ اس خیال سے کہ کبھی تو تھک ہار جائے گا اور مجھ سے ملنا بند کر دے گا۔ لیکن وہ میرے ہر مذاق کو سچ سمجھتا رہا۔ دھوکا دیتی رہی۔ وہ ہنستا رہا۔ وہ سچا آدمی ہے۔ اُسے وقتی دوست کی نہیں۔ ایک بیوی کی ضرورت ہے۔ اب میرا ضمیر مجھے کوستا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ۔"
"تمہیں مجھ سے محبت نہیں۔ اپنے دل سے پوچھ کر جواب دو۔ تم کسی کی بیوی بن کر بھی میری دوست نہیں رہو گی۔ سوچ کر جواب دو۔"
مولیناں نے ٹھہری ہوئی آواز سے جواب دیا۔
"محبت قائم رہے گی۔ لیکن میں تمہیں اپناؤں گی نہیں۔ تم سے دور رہوں گی۔ اب میں اُسی لڑکے سے شادی کروں گی۔ جس کی محبت کا آج تک مذاق اڑاتی رہی۔"
پیارے لال دروازے سے لگا گم سم کھڑا رہا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دونوں آوازیں جانی پہچانی ہوں۔ دونوں آوازوں کو مدت تک قریب سے سنا ہو۔ لڑکے کی آواز میں وہی پرانا بناوٹی درد تھا۔ بناوٹی ہمدردی تھی۔ التجا تھی جس کا وہ عادی بن چکا تھا۔ مولیناں کی آواز میں سختی تھی۔ بناوٹ تھی اور مصنوعی رعب تھا۔ پیارے لال کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مولیناں آج تک اس کی محبت کو مذاق سمجھتی رہی۔ آج تک ہر لڑکی نے اس کی محبت کو مذاق سمجھا تھا۔ لیکن آج مذاق ختم ہو گیا تھا۔
وہ مولیناں کا وہی محبوب تھا۔ جو یونیورسٹی میں بات کرتا تھا۔ جو اسے شادی کا چکمہ دے کر جاڑ کر بھاگ گیا تھا۔ لیکن بڑے مزے کا آدمی تھا۔

بالکل جان ہیگ کے پیگ کی طرح جس سے وہ اب بھی پیار کرتی تھی۔ اس سے انتقام لینے کے لئے کسی کی بیوی بننا چاہتی تھی۔ وہ کون تھا جانی پہچانی باتیں جانی پہچانی آواز کس کی تھی۔ پیارے لال سوچتا رہا۔ اسے اب یقین ہوگیا تھا کہ پیارے لال نام ایک ایسی شے کا ہے جس کا دل رکھنے کیلئے نگل لیا جاتا ہے۔ طبیعت اوب جانے پہ ترکرکے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ پیارے لال کے من میں آیا کہ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جائے۔ اور مولیناں کا گلا دبوچ کر کانوں میں بلند آواز کہہ دے ''شریف آدمی اپنی خواہشوں کا کبھی کبھی اس ڈھنگ سے کبھی مذاق اڑاتے ہیں'' لیکن بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ خون کے گھونٹ پیتا رہا۔

کمرے کے اندر آواز دوبارہ کسمسائی۔ لڑکے نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

''وہ شریف لڑکا ہے کون؟''

''اسے دیکھ لینا کبھی۔ بے حد غریب اور شریف ہے''

''تمہاری زندگی میں غریب اور شریف لڑکے کب سے آنے لگے؟''

''جب سے تمہارے جیسے لڑکے زندگی سے دور ہو گئے''

''میں تمہارے ساتھ اسے کبھی دیکھ سکوں گا''

''کیوں نہیں۔ میں اس سے شادی کر رہی ہوں''

''مجھے شک ہے''

''کیوں؟''

''وہ کبھی آئے گا نہیں۔ مرد معصوم ہو سکتے ہیں۔ لیکن اتنے بے وقوف نہیں ہوتے۔ وہ تمہاری چالیں جان گیا ہوگا۔ جیسے کئی دوسرے جان گئے۔ تمہارا انتظار بے سود ہے۔ میں نے تمہیں اور تم نے حسب فطرت اس شریف کو دھوکہ دیا۔ ہم دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں صرف جنس میں تضاد ہے۔ ہم دونوں محبت اور شادی کو مذاق سمجھتے ہیں۔ دونوں وقتی رشتوں کے قائل ہیں۔ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ آوارہ ہیں۔ دھوکے باز ہیں۔ فریبی ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ اور ہماری محبت دوستی اور لگاؤ کی داستان پرانی ہے۔ جو ختم ہوتے نہ ہوگی۔ لیکن اب میں تمہاری طرح کسی شریف لڑکی کا مذاق بھی نہیں اڑاؤں گا۔ تمہاری طرح اپنا دل بہلانے کیلئے بھی نہیں۔ جب چاہو میرے پاس آسکتی ہو۔ میرے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے اور پھر ان دنوں تمہیں میری ضرورت بھی ہے۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر تو دیکھو۔ محبت مذاق ہے اور جوانی وقتی اور زندگی طویل۔ جب یہ تینوں چیزیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو جاتی ہیں تو مجھے زندہ رہنے کے تمام سامان خود بخود مل جاتے ہیں آج تک ملتے آئے ہیں۔ تم جانتی ہو۔ تمہاری جیسی کئی لڑکیاں جانتی ہیں۔ کیونکہ آج کی محبت کا پروردہ ہوں۔ میں انتظار کروں گا۔ اپنی اور تمہاری زندگی کے لئے''

مولیناں سرد پڑ گئی جیسے اس کی قوت گویائی ختم ہو گئی ہو۔

لڑکا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔ وہ لڑکے کے ساتھ نیچے اترا۔ سڑک کی روشنی میں دیکھا۔ اس کا اپنا پرانا ساتھی تھا۔ رائے کا نام دل کی گہرائیوں سے اٹھا۔ اور ہونٹوں پر ہی منجمد ہو گیا۔ رائے دور اندھیرے میں گم ہو گیا۔ لیکن اسے لگا جیسے وہ اس کے قریب کھڑا ہو اور اس کے کانوں میں سرگوشیانہ انداز سے کہہ رہا ہو ''پیارے لال سامنے والے درخت کے ٹہنے پہ رسی باندھ دے تاکہ آخری بار زندگی کی پینگ بڑھا سکوں!

پیارے لال کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور چہرہ کسی انجانی مسرت کے احساس سے تمتما اٹھا۔ آہستہ قدم آگے بڑھنے لگا۔

اردگرد گھُپ اندھیرا تھا۔ اس نے مرگ آلود سناٹے میں نظریں گھُماتے ہوئے اپنے آپ سے کہا ــــ "پیارے لال نام ہے گھپ اندھیرے کا۔ آج میں سچے دل سے اپنے اندھیرے کو اپناتا ہوں ..... اپنی ذات کو اپناتا ہوں ــــ محبت کا دوسرا نام مذاق ہے اور جوانی وقتی اور اور زندگی طویل ــــ میں آج سے دنیا کی ہر چیز سے مذاق کروں گا۔ محبت کو وقتی محبوبہ سمجھوں گا۔ بیوی کی کبھی تمنا نہیں کروں گا۔ مستقبل کے بارے میں کبھی نہیں سوچوں گا۔ کسی سے حقیقی پیار نہیں کروں گا!"

وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ مولیناں کا ننگ دھڑنگ سایہ اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس نے اپنے بوجھل ذہن کو دو تین جھٹکے دیئے اور بیچ سڑک میں کھڑے ہو کر ولائتی شراب کا نشہ اُگل دیا۔ جس میں مولیناں جیسی ان گنت نیم ولائتی نیم دیسی لڑکیوں کے پیار کا خمار تھا!!۔

ادبِ لطیف (لاہور)

انور سجاد

سیّد بادشاہ

اگر مجھے یہ پتہ ہوتا کہ منی کے ساتھ زندگی بیتانے کا خواب بھی کانچ کا ثابت ہوگا تو میں یہ خواب کبھی نہ دیکھتا۔ لیکن خواب دیکھنے بھی تو اپنے بس میں نہیں ہوتے۔ جانے یہ کہاں سے آتے ہیں اور نیند کو مسکراہٹوں سے ویران کرتے ہوئے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ صرف ان کی بے جان لاشوں پر ہماری زندگی کی عمارت بنتی رہتی ہے۔

جب میری اداس سی خاموشی سے زلفی بور ہو کے پریشان ہوگیا تو اسنے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس کی زمینوں پر چلا جاؤں۔ گاؤں کی زندگی ہینیٹ کروں شاید اس طرح میرا دل بہل جائے۔

وہ خود تو سرکاری امتحان میں مصروف تھا، اس لئے میرے ساتھ نہ جا سکا۔ میں اس کے گاؤں میں پہلی بار جا رہا تھا۔ سارا راستہ ریل گاڑی پر بھی اور بیل گاڑی پر بھی مجھے یہ خیال رہ رہ کر تنگ کر رہا تھا کہ جانے میں وہاں رہ بھی سکوں گا یا نہیں۔ لیکن جب میں وہاں پہنچا تو مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں بھول کے کسی ماؤنٹ اولمپیا پر پہنچ گیا ہوں۔ جہاں میری حیثیت بالکل جیوپیٹر ایسی ہے۔ تاج سرور کی مختصر سی آبادی میری پرستش پر تلی ہوئی تھی۔

میرے وہاں پہنچنے کے ایک دو دن بعد تک آم کے درختوں میں چھپی، زلفی کی خوبصورت سی کوٹھی میں زمینوں کے نوکروں کے علاوہ دوسرے گاؤں کے لوگ بھی اپنے سیّد بادشاہ یعنی مجھ سے ملنے کے لئے آتے رہے۔ وہ میرے گھٹنوں اور ٹخنوں کو چھو کر اپنی آنکھوں سے لگانے کے بعد باغیچے میں میرے گرد یوں بیٹھ جاتے جیسے میں ابھی آگ کو گلزار بنا دوں گا یا قُم باذن اللہ کہہ کر کسی قبر سے جیتا جاگتا انسان برآمد کر لوں گا۔

وہاں کے لوگ صبح کھیتوں کو جانے سے پہلے مجھے سلام کرنے کے لئے آتے، میری زیارت کرنا وہ نیک شگون تصور کرتے تھے شام کے وقت تمام نوکر میرے پاس باغیچہ میں آ کر زمین پر بیٹھ جاتے، اور پھر حقہ کی گڑگڑ میں دنیا بھر کے قہقہے گونجتے سجوارے کی جگتوں پر کریم، سلطانا اور بابا روشن خاص طور پر لوٹ پوٹ ہوتے۔ سجوارا اپنے پٹواری کی نقل اتارتا تو سب یوں محسوس کرتے کہ وہ بے ایمان پٹواری سے بدلے لے رہے ہیں۔ اگرچہ پٹواری کا تعلق براہ راست زلفی سے تھا۔ کیونکہ مخالفوں سے رشوت لے کر وہ ایک مربع کی حدبندی میں گڑبڑ کرنا چاہتا تھا۔ زلفی کے نوکر اس کی خاطر جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اس نے انہیں یہ احساس دلا دیا تھا کہ زمینوں کا وہ تنہا مالک نہیں بلکہ ہر وہ انسان ہے جو اس زمین کو اپنے خون پسینے سے سینچتا ہے۔

میں باتوں باتوں میں اپنے گلے سے سید بادشاہ کی جوگ اتارنے کی پوری کوشش کرتا کیونکہ مجھے ان کے رویہ سے بڑی خفت سی ہوتی تھی سجوارا مجھے بے انتہا پسند کرنے کے باوجود میرے اس نظریئے کا شدید مخالف تھا اس کا ایمان تھا کہ دنیا اور آخرت میں سکھ پانے کا واحد ذریعہ سید بادشاہ ہیں۔ اسکی باتوں سے لگتا تھا کہ سید ہونیکے باوجود اگر میں نے اسکے نظریئے کو غلط ثابت کرنیکی کوشش کی تو وہ مجھے بھی زمین میں بیج کے اوپر سہاگہ پھیر دیگا۔ میں نے خاموشی میں اپنی بقا سمجھی۔ سجوارا ایک عجیب وغریب انسان تھا، وہ عجیب بھی اتنا ہی تھا جتنا کہ غریب، اس کا جسم کپاس کے پودے کی طرح کھردرا تھا، لیکن اُس کے ہونٹوں پر ہر وقت زعفران کے کھیت جھومتے تھے۔ اُس کے پچکے ہوئے گالوں کے ساتھ لپٹے ہوئے موٹے موٹے ہونٹوں پر بڑی خوفناک مونچھوں کا بسیرا تھا، جنہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا جیسے منشی جی کے ایلسیشن کتوں کی دُمیں کاٹ کر ناک کے نیچے چپکا دی گئی ہیں، وہ کچھ اسی قسم کا جانور تھا، جس کی دم اس شخص کے لئے ہلتی تھی جو اسے پچکارتا تھا۔ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ دیوانہ ہے کیونکہ آج تک کسی نے اسکی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے تھے۔ وہ ہر وقت ہنستا تھا، اس کے اپنے قول کے مطابق اس کا دل دکھوں کا گھوارا تھا، لیکن آج تک کسی نے اسے اداس بھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ بڑی اونچی آواز میں بات کرتا تھا۔ بات کرتے وقت اُس کے ہونٹ لٹک سے جاتے، اور منہ سے جھاگ اُڑ اُڑ کر مونچھوں پر جمتا رہتا۔ اگرچہ اتفاقاً کبھی اُس کا منہ بند ہوتا تو لعاب کی ایک پتلی سی لکیر اس کے ہونٹوں کے درمیان قلفی کی طرح جمی رہتی۔ وہ بہت کم چُپ رہتا تھا، فصل کاٹتے ہوئے اگر کوئی پاس نہ ہوتا تو وہ فصلوں سے درانتی سے باتیں کرتا ہنستا رہتا، اس کے چہرے پر مانوسی اور اجنبیت کا عجیب سا تاثر ہر وقت رہتا تھا، جسے محسوس نہ کرنے کے باعث منشی جی کے الیسشن کتے بھونکتے ہوئے اس پر لوگوں کے کاٹنے کی ریہرسل اکثر کرتے پھر پہچاننے کے بعد اس سے یوں چمٹ جاتے جیسے برسوں سے بچھڑا ہوا بھائی لوٹ آیا ہو

میں نے روشن بابا سے استفسار کیا کہ سجوارا ایسا کیوں ہے۔ وہ یہی کہتا کہ اسکے دماغ کے پیچ پیدائشی ڈھیلے ہیں، اس لئے ہر وقت بیل گاڑی کے پہیئے کی طرح چرچراتا رہتا ہے۔

ایک دوپہر سجوارا میرے لئے گنے لے کر آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ زمین پر ذرا ٹھہر کر جائے، اور میرے ساتھ بیٹھ کر گنے چوسے، پہلے تو وہ نہ مانا پھر اس نے اپنے سید بادشاہ کے مجبور کرنے پر دو گنے گانٹھ سے نکالے۔ اور میرے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا، اور وہ گھبرا کے یوں سکڑنے لگا جیسے سکڑ سکڑ کے ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ میں نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔

"سجوارے۔ تم مجھ سے اس طرح سلوک کیوں کرتے ہو۔ میں انسان نہیں"

"نہیں جی۔ آپ تو انسان نہیں۔ آپ تو فرشتوں سے بھی اُونچے ہیں۔"

جانے ہم کیوں ہنس دیئے۔

"سجوارے ایک بار تم نے کہا تھا کہ تمہارا دل دکھوں کا گھر ہے، وہ کون سے دکھ ہیں سجوارے.. تم ایسا انسان بھی دکھی ہو سکتا ہے۔"

"چھوڑیئے شاہ جی۔ آپ بھی کونسی بات لے بیٹھے ہیں"

"دکھ بٹ جانے سے بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔"

ایک لمحہ کے لئے میں بالکل خالی الذہن ہو گیا۔ پھر مجھے فوراً سوجھی۔

"دنیا اور آخرت کا سکھ پانے کا بوجھ تو تم نے اپنے سید بادشاہ کے کاندھوں پر ڈال ہی ہوا ہے یہ بوجھ بھی ہلکا کر لو"

میری دلیل اس کی سمجھ میں آ گئی، اور اُس نے کچھ سوچنے کے بعد کئی لطیفوں کے ساتھ اپنے ماضی کا خلاصہ سنا دیا۔

سجوارے کا جسم کپاس کے پودے کی طرح کھردرا ضرور تھا، لیکن یہ پودا بانجھ نہیں تھا، اس میں کومل روئی بھی کھلتی تھی، اس کا دل

بالکل روئی تھا جو حالات کی آنچ سے جھلس گیا تھا، جانے یہ چنگاریاں اُس کے ہونٹوں پر زعفران بن کے کیوں کھلی تھیں، شاید اس لئے کہ بہت سارے دُکھ مل کے انسان کو گدگدی کرتے رہتے ہیں۔

سجوارے کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی، اتنی کہ اس کے گاؤں کی دوسری مائیں اپنے بگڑے ہوئے بیٹوں کو سجوارے کی محبت اور فرمانبرداری کی مثال دیا کرتی تھیں، اتنی فرمانبرداری اور پیار کے باوجود سجوارے نے اپنی ماں کا دل توڑا تھا، جہاں وہ شادی کرنا چاہتا تھا اس کے والدین اس لڑکی کے حق میں نہیں تھے، ماں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ لڑکی کا کردار بھی مشکوک ہے، سجوارے کا خیال تھا کہ ماں یہ کیڑے اس لئے ڈال رہی ہے کہ وہ اس کی بھانجی سے شادی کر لے۔ وہ اپنی ماں کی بات مان لیتا لیکن یہ رانجھوں اور میرزوں کے عشق کی عزت کا سوال تھا۔ اور اس کی خالہ کی لڑکی اس کی ہیر یا صاحباں نہیں تھی اگر ہوتی تو وہ اس لڑکی کی بھینگی آنکھ کی بھی پرواہ نہ کرتا، ماں کو اس بہو کی بھینگی آنکھ میں کوئی نقص نہیں نظر آتا تھا کیونکہ لڑکی کے باپ کے پاس بہت زمین تھی۔ اور صرف زمین کی خاطر سجوارا اُن شاموں کو فراموش نہیں کر سکتا تھا، جو اس نے غلام فاطمہ کے ساتھ بتائی تھیں —— وہ غلام فاطمہ جو سجوارے کے چوڑے چکلے سینے پر سر رکھ کر اس کے بازوؤں میں تڑپتی مچھلیاں اپنے قابو میں کر لیا کرتی تھی، غلام فاطمہ کو مان تھا کہ اگر سجوارا جنگلی سور کے ساتھ بھی لڑے تو اُس کی گردن دبا کے مار سکتا ہے — وہ واقعی اتنا ہی طاقتور ہوگا کیونکہ گوشت گھلنے کے باعث اب کسی ہوئی کھال یوں محسوس ہوتی تھی جیسے زمین میں بہت گہرا ہل چلایا گیا ہو۔ اس ہل نے پہلا زخم اس وقت دیا تھا جب اس نے بھینگی کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اس شادی پر موت کو ترجیح دیگا، اس لئے ماں نے غریب لڑکی کو گھر میں لانے پر موت کو ترجیح دی۔ اسی شام اس کے سر میں شدید درد اٹھا اور بخار چڑھ گیا، لیکن سجوارا اپنی ضد پر قائم رہا۔ وہ غلام فاطمہ کو دیا ہوا قول ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ غلام فاطمہ کے ساتھ شادی کے تیسرے چوتھے روز بعد ہی اس کی ماں اس غم میں گھل کر مر گئی کہ وہ لٹکی اب بہو بن گئی ہے۔ جس نے اس اتنے فرمانبردار لڑکے کا بیڑا غرق کر دیا کہ وہ پیار کے نشے میں اپنی ماں کو بھی بھول گیا۔ سجوارے کے باپ کو مرحومہ کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے صرف یہی طریقہ نظر آیا کہ اس نے اپنے بیٹے اور بہو کو اپنی ویران تھوڑی بہت زمین سے عاق کر کے گھر سے نکال دیا۔ سجوارے کو زمین کے کھو جانے کا کوئی غم نہیں تھا۔ اسے غم تھا تو صرف اپنی ماں کی موت کا، جس کی زندگی کسی کی جائداد نہیں تھی کہ اسے ورثے میں مل سکتی، لیکن اس نے اس غم پر بھی غلام فاطمہ کی مسکراہٹوں کی چادر ڈال دی تھی، گھر سے نکل کر وہ چند دن اپنی سسرال میں رہا۔ پھر اُس کی غیرت نے جوش مارا، اور دو چار دن خاک چھاننے کے بعد اسے سسرال سے چوتھے گاؤں زیلفی کے ہاں ملازمت مل گئی۔

پورا سال بیلوں کے گلوں میں پڑی گھنٹیوں کی سندر جھنکار کی طرح گزر گیا۔

پھر رفتہ رفتہ جانے کیوں غلام فاطمہ کو کپڑوں اور گہنوں کا شوق پڑ گیا، شاید دوسرے نوکروں کی بیویوں کو دیکھ دیکھ کے ..... حالانکہ وہ تو زیلفی کے ہاں کئی سالوں کی نوکری کے بعد اس قابل ہوئے تھے کہ اپنی بیویوں کو سجا سکتے، اسے تو ابھی صرف ایک سال ہی ہوا تھا، غلام فاطمہ کو جب بھی طعنہ دینے کی ضرورت ہوتی تو اُسے کپڑے اور گہنے یاد آ جاتے۔ وہاں کے تمام لوگوں کو اس جھگڑے کا علم تھا۔

سجوارے نے ایک بات جو اس وعدے پر مجھے بتائی کہ میں کسی اور سے نہ کہوں، سن کر میرا رواں رواں کانپ اُٹھا۔

سارا دن کھیتوں میں کام کرنے کے بعد جب وہ وہ گھر جاتا تو غلام فاطمہ لڑ لڑ کر اُسکا ستیاناس کر دیتی کہ اس نے اس منحوس دن اس سے ٹیوب ویل سے پانی بھر کے لانے کو کیوں کہا تھا۔ اچھی بھلی وہ منشی جی کے پمپ سے پانی بھرا کرتی تھی۔ ٹیوب ویل سے گھڑا بھر کے کولہے پر رکھتے ہی کائی جمی اینٹوں سے اس کا پیر پھسل گیا، اور اینٹوں کے فرش پر گرتے ہی اس کے پیٹ میں پڑی ہوئی پینگ ٹوٹ گئی، اتنا خون ضائع ہونے پر نقاہت کے باوجود وہ سجوارے کے سینے پر سر رکھ کر خوب روئی، سجوارے نے اسے بڑی تسلّی دی کہ خدا کی یہی مرضی تھی، اگر اس نے چاہا تو ایک، نہیں جانے کتنی پینگیں اُسکے پیٹ میں پڑیں گی، غلام فاطمہ کے آنسو بچوں کی آس نے پی لئے لیکن جب یہ آس بھی ٹوٹ گئی تو ٹیوب ویل سے پھسلنے کا سارا الزام سجوارے کے سر آ گیا۔ سجوارے کے قول کے مطابق یہ بھی خدا کی مرضی تھی، کہ بچہ ضائع ہونے کے تیسرے ہی روز وہ گھوڑی پر چڑھ کے رات کے وقت کھیتوں کا

چکر لگا رہا تھا کہ گھوڑی شاید سانپوں کی پھنکار سے بدک گئی، منہ زور گھوڑی ڈر کے جو بھاگی تو بالکل ہی بے قابو ہوگئی، پھر بھاگ سو بھاگ ......
اس کے بعد اسے اتنا پتہ چلا کہ گھوڑی کو ٹھوکر لگی ہے ــــ اور اسے ہوش اس وقت آیا جب گاؤں کی ڈسپنسری میں اس نے غلام فاطمہ کے نرم نرم ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ وہ ایک ہفتہ بعد ڈاکٹر نے اسے ہسپتال سے ڈسچارج کرتے وقت بتایا کہ زندگی کا چشمہ ٹاہلی کا وہ ٹھنڈ پی گیا ہے، جس پر وہ پیٹ کے بل گرا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرے چھا گئے۔ غلام فاطمہ کے پیٹ میں جھولا ڈالنے کے ارمان کو وہ اندھیرے ڈس گئے، اور وہ اس ٹھنڈ کی طرح خشک ہوگیا، جس پر وہ پیٹ کے بل گرا تھا ــــ جب غلام فاطمہ کو پتہ چلا تو اس کی نظروں میں وہ سجوارا مر گیا جو اسے اپنی باہوں کے بیلنے میں لے کر اسے گنے کی طرح نچوڑ دیا کرتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس نے خود ہی سجوارے کو بڑی تسلی دی تھی، پھر سجوارے کی طاقتور باہیں اسے کیکر کی خشک ٹہنیاں محسوس ہونے لگیں۔ تو آہستہ آہستہ غلام فاطمہ کی تسلیوں میں طنز کا عنصر نمایاں ہوتا گیا ــــ اور وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اس سے دور رہی ہوتی گئی ــــ سجوارا جانے کس آس پر اس کا پیچھا کرتا کہ شاید کوئی بگولا اسے اڑا کر غلام فاطمہ تک لے جائے سجوارے نے مجھے ــــ بتایا کہ غلام فاطمہ کو پیار تو اب بھی مجھ سے اتنا ہی ہے۔ لیکن آپ خوب جانتے ہیں کہ عورت کو زیور کپڑے اور بچوں سے بڑھ کر اور کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ مجھ سے ناراض ناراض سی رہتی ہے۔ شاہ جی۔ حالانکہ سجوارے کی باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے بہت دور ہو چکے ہیں۔

یہ تھے وہ حالات جنہوں نے سجوارے کے دل کی روئی میں انگارے بھرے تھے، اس کے ہونٹوں کو کڑوی مسکراہٹیں اور کھانٹے دار قہقہے عطا کئے تھے ــــ سجوارہ خاموشی سے اپنے آنسو پی کر گنا چوسنے لگا۔ اور میں سپی کے دیئے ہوئے دکھ کو بھول کر زندگی پر غور کرنے لگا کہ کس طرح محض حادثے اور اتفاقات زندگی کو دلہن بنا دیتے ہیں۔ بیوہ کر دیتے ہیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ سجوارے کی ایک ایسی تصویر بناؤں، جس میں دنیا بھر کے آنسو اور قہقہے بھر دوں لیکن برش میرے ذہن کا ساتھ دینے سے قاصر تھے۔

بہادرے ترکھان اور مستری محمد حسین کی تعریفوں کے باعث مجھے سجوارے کی بیوی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے میکے گئی تھی، میں نے سجوارے سے اس کی آمد کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا:

"جی بادشاہ لوک ہے جب جی چاہے آجائے۔"

پھر کپاس کی گود سفید سفید چودوں سے بھرنے لگی۔

سارا سارا دن عورتیں روئی چنتی رہتی تھیں، اور میں قریب ہی کسی جگہ بیٹھا تصویر کشی کرتا رہتا۔ ان کے پاس جانے کی مجھے ہمت نہ ہوتی مبادا وہ کالی تیتریاں اپنے تیتروں سے شکایت کر دیں۔ اور ان کا سید بادشاہ کمادوں میں اڑتے باز میں ڈھل جائے اور وہ اس باز کی گردن مروڑ کے گاؤں سے باہر پھینک دیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے زمین میں بو کر اوپر سے سہاگہ پھیر دیتے۔ اس تصور سے میری روح کانپ اٹھتی تھی۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ ایک مٹیار ہمیشہ مخالف سمت سے کپاس چنتی ہے۔ اس کا منہ میری طرف ہوتا ہے۔ شاید مجھے متوجہ کرنے کے لئے وہ بہت بلند آواز سے باتیں کرتی ہے۔ اور غالباً میری طرف دیکھ کر بار بار مسکراتی بھی ہے جیسے دیسی فلموں کا ہیرو نہیں بننا چاہتا تھا جو گاؤں آکر کسی نہ کسی شامت کی ماری لڑکی پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی جانے کیوں اس کے زرد دوپٹے کا حلقہ میری گردن کے گرد تنگ ہوتا گیا۔

ایک روز منشی صاحب نے مجھ سے کہا کہ دن ڈھلے جب عورتیں ان کے گھر روئی جمع کرانے اور ونڈائی لینے آتی ہیں تو بڑا اچھا منظر ہوتا ہے۔ آپ مصور ہیں ان کی تصویر بنالیجئے۔ میں نے سوچا ممکن ہے اس بہانے اس زرد دوپٹے والی لڑکی کو بہت قریب سے دیکھ سکوں۔ چنانچہ میں نے ان کی دعوت منظور کر لی۔

دوسرے دن میں اسکیچ بک لے کر اپنے ذہن میں اس لڑکی کی تصویر بناتا منشی صاحب کے ہاں پہنچ گیا۔

مجھے کوٹھے کی چھت پر بیٹھے ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ نیچے صحن کے دروازے سے عورتیں شور مچاتی داخل ہوئیں۔ پھر سب سے آخر میں زرد آنچل ہوا میں لہرایا، اور وہ سب سے الگ تھلگ بیٹھ گئی وہ میرے ذہن کی تصویر سے کہیں مختلف تھی، وہ تو دیہاتی روپ میں رافیل کی میڈونا تھی میں نے اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایک چھوٹا سا کنکر اس کی طرف پھینکا، پھر وہ تمام عرصہ کنکھیوں سے میری طرف دیکھ دیکھ کر شرماتی رہی۔ مسکراتی رہی اور پھر شرماتی رہی۔

سورج دور ٹاہلیوں میں چھپ گیا۔ سب عورتیں چلی گئیں۔ اس نے اپنی ایک چھوٹی سی گٹھڑی ایک کونے میں رکھ دی۔ اور باورچی خانے میں آٹا گوندھنے لگی۔ میں سگریٹ سلگانے کے لئے ماچس لینے کے بہانے اس کے پاس چلا گیا۔۔۔ اُس کا نام گومی تھا۔ جلدی اور گھبراہٹ میں اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ وہ کل صبح مجھ سے خشک کنوئیں پر ملے گی۔

خشک کنوئیں پر اُگے ہوئے بڑ کے درخت کی اوٹ میں اُس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے کتنے ہی دنوں سے دیکھ رہی ہے۔ اور میں اسے بہت اچھا لگتا ہوں۔

گومی ہر روز مجھے وہیں ملنے لگی۔ بعض وقت موقع پا کر میرے گھر بھی آ جاتی۔۔۔ وہ کون تھی یہ جاننے کی مجھے ضرورت ہی نہیں تھی۔۔۔ نہ چاہنے کے باوجود میں دیسی فلموں کا ہیرو بن چکا تھا۔

یہاں میں نے سنا تھا کہ لڑکی کے والدین۔ لڑکے والوں کو پانچ چھ سو روپے کے عوض اپنی لڑکی کا ہاتھ تھما دیتے ہیں، مجھے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں گومی بھی نہ بک جائے۔ پھر میں نے ایک روز گومی سے شادی کے لئے کہہ ہی دیا۔ اُس نے میری قمیص کے بٹنوں سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔

"آپ مجھے گہنا پہنائیں گے نا؟"

"گہنا۔ اگر کہو گی تو سونے میں تول دوں گا"

جب میں نے اس سے اس کے ماں باپ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ ماں باپ بہت سخت ہیں کبھی نہیں مانیں گے۔ اور اگر مجھے اس کے ساتھ اتنا ہی عشق ہے تو میں اسے اپنے ساتھ بھگا کے لے جاؤں۔ یہ کہہ کر وہ ہنستی ہوئی کپاس چننے لگی۔

میں بیاہ اور اغوا کی گنجلک میں پھنسا اپنے گھر کی طرف چلنے ہی لگا تھا کہ مستری محمد حسین آ گیا۔۔۔ اس نے اپنی تیل آلود نوجوان مونچھوں کو بل دیتے ہوئے بڑے عجیب انداز میں کہا۔

"اے میں نے کہا شاہ جی۔۔۔ یہ سجوارے کی بیوی سے کیا بات چیت ہو رہی تھی"

"سجوارے کی بیوی ... گومی۔ ؟"

"جی ہاں۔ گومی۔ غلام فاطمہ"

مستری نے جاتے ہوئے میرے کانوں میں جلتے ہوئے موبل کے ڈرم الٹ دیئے

"ہمارے ساتھ تو کبھی اس نے ہنس کے بات بھی نہیں کی۔ پر آپ۔ آپ شاہ جی ہوئے۔"

دوپہر کے وقت گومی میرے لئے لسی لیکر آئی تو میں اس پر برس پڑا۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔ جب میں خاموش ہو گیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے روتے ہوئے مجھے اپنی ساری کہانی سنائی، اور آخر میں کہا کہ اگر مجھے اس سے واقعی سچا عشق ہے تو میں اسے خشک ٹھنٹھ کے بھڑکتے ہوئے تنور سے نکال لوں۔ اس آگ میں جلتے ہوئے اسے چھ سات ماہ ہو گئے ہیں، اتنے موقعوں کے باوجود حرام ہے جو اس نے آج تک کوئی برا کام کیا ہو۔ سجوارے کی پگڑی کو خاک میں رگیدا ہو۔ لیکن اب ..... اب وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔

میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں سجوارے سے بات کروں گا۔ میں تمام دوپہر یہی سوچتا رہا کہ اگر مجھے گومی کے ساتھ محبت نہ ہوتی تو پھر

بھی اسے خشک ٹھنٹھ کی آگ سے نکالنا میرا فرض ہو جاتا۔ لیکن میں سجوارے سے بات کس طرح کروں گا۔؟
رات کھانے کے بعد میرے لئے سجوارا بھٹے لیکر آیا تو میں نے اٹک اٹک کر ساری بات اس سے کہہ دی۔ ایک دو پل کسی گہری سوچ میں ڈوبنے کے بعد اس نے میری ٹانگیں دباتے ہوئے کہا۔
"شاہ جی۔ وہ یونہی بکتی ہے، مجھے تو اس سے چاند چکور سے بھی زیادہ پیار ہے۔"
پھر میری آنکھوں کانوں اور عقل پر پردہ پڑ گیا۔ میرا دل میرے منہ میں آگیا۔ اور میں نے بڑی مشکل سے دنیا بھر کی خودغرضیوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔
"سجوارے۔ آج تک تم نے اسے کیا دیا ہے۔ اب تو تمہارا عشق منجمد ہو گیا ہے۔ وہ آگ نہیں رہی۔ گومی برف خانے میں نہیں رہ سکتی تم اسے طلاق دے دو۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
میری ٹانگیں دباتے ہوئے اس کے ہاتھ جم کر رہ گئے۔ "جی۔ شاہ جی۔" اس کے ادھ کھلے منہ سے لعاب ٹپکنے لگا۔ میں نظریں زمین پر گاڑھے خاموش تھا۔ سجوارا بھی خاموش تھا۔ اسکی مونچھیں خوف زدہ گھبرائے ہوئے کتے کی دم کی طرح دبی ہوئی تھیں۔
"شاہ جی ــــ وہ تو میری جورو ــــ"
"اور ــ اور پھر ــــ یہ تمہاری عزت کا بھی سوال ہے۔ سجوارے کیا پتہ کل کو وہ ــ۔"
"شاہ بادشاہ ــــ آپ کو انکار کرکے مجھے دوزخ مول لینا ہے۔! ہماری عزت تو شاہ جی آپ ہیں وہ جلدی جلدی میری ٹانگیں دبانے لگا۔ اس نے اس حقیقت کا اظہار بالکل نہ ہونے دیا کہ میں نے اس کے دل پر درانتی چلائی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں کل آکر گومی کو لے جاؤں گا۔
اگلی صبح ابھی ستارے دن کی گود میں ایک ایک کر کے سو ہی رہے تھے کہ کسی کے زور زور سے دروازہ پیٹنے پر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو باہر روشن چاچا بہت گھبرایا کھڑا تھا۔ "شاہ جی۔ چل کر دیکھئے۔ سجوارا پاگل ہو گیا ہے۔"
اس نے مجھے کچھ نہ بتایا اور میں اس کے پیچھے بھاگتا ہوا سجوارے کے گھر پہنچ گیا۔ باہر دوسرے نوکر سر جھکائے کھڑے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مجھے کوٹھری میں داخل ہوتے دیکھکر سجوارا میری طرف لپکا۔
"کیا بات ہے سجوارے۔؟"
"کچھ نہیں شاہ جی۔ آپ کو میری عزت کا بڑا خیال تھا۔ لیکن مجھے اپنی عزت سے زیادہ دوزخ کی آگ سے ڈر لگتا ہے۔ اپنے سید بادشاہ کو جھوٹی چیز کھلا کے کس کم بخت کو جنت نصیب ہونا تھی۔ شاہ بادشاہ، میں نے یہ ٹنٹا ہی ختم کر دیا ہے۔"
اس نے آہستہ آہستہ چارپائی پر پڑی رضائی کا پلو اٹھایا۔ میں نے لالٹین کی بتی اونچی کر کے دیکھا، کلہاڑی کی تیز دھار نے گومی کی گردن کاٹ کے رکھدی تھی، خدا معلوم کہ اس کے دل سے پاگل قہقہوں کے فوارے کیوں پھوٹ نکلے۔ میں نے گھبرا کے سجوارے کو دیکھا، اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، اس کے چہرے اور ہونٹوں پر خون جما ہوا تھا۔ اور اس کی مونچھیں زور زور سے ہل رہی تھیں۔... جیسے منشی جی کے السیشن کتے اپنی وفاداری کے اظہار کے لئے ہلایا کرتے تھے۔ ــــ یہ دمیں اپنے سید بادشاہ کے لئے ہل رہی تھیں یا اپنی غلام فاطمہ کے لئے ــ یہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔

شروں کمار ورما
داستان گو (لاہور)

بُرا آدمی

ہریش نے لان میں شور سُن کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ لالہ سوہن لال کے چھوٹے لڑکے کے ہاتھ میں بہن کی چوٹی تھی اور وہ اسے گالیاں دے رہی تھی۔ ہر گالی پر بھائی چوٹی کو زور سے جھٹکا دیتا۔ لڑکی زور سے چیختی اور گالیوں کی رفتار اور بھی تیز کر دیتی۔

ہریش کے دل میں آیا کہ جا کر زنّاٹے کے تھپڑ دونوں کے جڑے اور سوہن لال سے کہہ دے کہ وہ اس کی کوٹھی خالی کر دے لیکن وہ اپنی چھوٹی بھابی سمترا دیوی کا خیال کر کے غصہ پی گیا۔

سوہن لال جی سمترا دیوی کے بھائی تھے اور تبدیل ہو کر جب سے اس شہر میں آئے تھے ہریش کی کوٹھی میں مقیم تھے تقریباً سال بھر سے نہ کرایہ دیتے تھے اور نہ ہی جگہ خالی کرتے تھے۔ دوسرے تیسرے مہینے مسکرا کر کہہ دیتے "کیسا شہر ہے تمہارا کوئی ڈھنگ کی جگہ ہی نہیں ملتی۔ اب بال بچوں کو لیکر چنگڑوں کے محلّے میں جا کر رہنے سے تو گیا۔ اچھا اور سناؤ، کیا حال ہے، کوئی نئی تازی؟"

ہریش بل کھا کر رہ جاتا۔ بھائی بھاوج کے منہ کو وہ ان لوگوں کو جگہ دیئے ہوئے تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اشارے سے بھابی کو سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن وہ تھیں کہ رامائن کا نام سنکر مہابھارت کا ذکر لے بیٹھتیں اور ہریش اندر ہی اندر کھول کر رہ جاتا۔

اب بچوں کے ساتھ ان کی ماں بھی چیخنے اور گالیاں بکنے لگی تھی۔

ہریش نے پٹاخ سے کھڑکی کے پٹ بند کئے اور کمرے کو تالا لگا کر باہر نکل گیا۔ وہ کسی خاص پروگرام کے تحت تو نکلا نہیں تھا اس لئے بڑے بھائی رام چندر کی کوٹھی کی طرف چلا گیا۔ دو چار روز ہوئے وہ رات کو کارخانے سے لوٹتے ہوئے کہہ گئے تھے "تمہاری بھابی یاد کر رہی تھیں"

جب وہ کوٹھی میں داخل ہوا تو چھوٹے بچے خوشی میں اچھلنے کودنے لگے "انکل آ گئے، انکل آ گئے"

بڑی بھابی سرسوتی دیوی نے منّی کو ڈانٹا "تجھے کئی بار سمجھایا ہے کہ انکل جی، کہا کر بڑوں کو اس طرح بلاتے ہیں۔ نالائق کہیں کی"

"ارے نہیں بھابی، انکل ہوا انگریزی کا لفظ اور جی، ٹھہرا ہندوستانی شبد۔ بھلا یہ جوڑ کیا ہوا۔ منّی بیٹا انکل ہی ٹھیک ہے"

"میں انگریزی وِنگریزی تو جانتی نہیں۔ بڑوں کو جی، کہنا چاہیئے" بھابی بولیں "تو تم ابھی تک بیٹھے نہیں۔ چائے پیو گے یا کوفی"

"کوفی پلا دو بھابی، کہتا ہوا ہریش ٹیٹو کو لیکر بیٹھ گیا۔

"بس کوفی پی پی کر اندر خشک کر لے" بڑے بھیّا نے لاڈ سے کہا۔

"بچپن سے ہی اسے دودھ اچھا نہیں لگا" بھابی نے حسبِ عادت اس کے بچپن کی بات دہرائی۔ "پکڑ پکڑ کر دودھ پلایا کرتی تھی۔ میں اسے، اور یہ اتنا ضدی تھا کہ زور سے دانت بھینچ لیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ تو میری انگلی کاٹ لی تھی۔ بڑا شریر تھا"

ہریش جانتا تھا کہ اب بھابی کہیں گی کہ ڈیڑھ دو سال کا تھا جب ماتا جی مری تھیں۔ اور اپنی ماں کا ذکر سن کر اسے آنسو روکنے مشکل ہو جاتے تھے۔ اس نے ہوش میں ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ دونوں بھاوجوں سے ماں کے بارے میں سنتا تھا اور جب بھی اس کی ماں کا ذکر آتا، اس کا ماتا کا پیاسا دل، لوریوں کی مدھر آواز کو ترستے کان، پیار بھری تھپکیوں اور ماں کی گود سے دور بڑھا ہوا جسم رو اٹھتا۔ وہ کئی کئی دن اداس رہتا۔ وہ کتنا بدنصیب تھا کہ اسے ماں کا پیار نہیں مل سکا۔ اور پھر یہ غم اور بھی شدید ہو جاتا۔ ایک غم دوسرے کو آواز دیتا۔ ایک خیال دوسرے کو جنم دیتا اسے ماں کا پیار نہیں ملا۔ پھر باپ بھی مر گیا۔

اس نے بھابی کو ٹوک دیا "کوئی بناؤ بھابی، میں نے جانا ہے"

"ابھی آئے ابھی جانے کی بھی سوچ لی۔ آج نہیں جانے دوں گی، رات یہیں رہنا" کہہ کر بھابی نوکر کو آواز دینے چلی گئیں۔

کوفی پیتے ہوئے بھابی نے پوچھا "سوہن لال جی کا کیا حال ہے، مکان ملا کہ نہیں انہیں" بات کر کے وہ خود ہی مسکرا دیں۔

"بھابی میں تو تنگ آگیا ہوں۔ ان کے بچے وہ شور مچاتے ہیں کہ چین سے بیٹھنا حرام کر دیا ہے۔ ایک ان کی سرمیتی جی ہیں کہ گلے میں چوبیس گھنٹوں لاوڈ سپیکر فٹ رہتا ہے"

"تو انہیں نکالتا کیوں نہیں۔ سال بھر تو ہو چلا۔ ایسے وہ جانے کے نہیں" بھابی نے خاوند کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا اور پوچھا "کیوں جی؟"

"اور کیا" بڑے بھائی نے کہا "کرایہ بھی دیتے ہیں کہ نہیں؟"

"لو اور سنو، کرایہ دینا ہوتا تو اور جگہ نہیں مل سکتی کیا، تم سمترا کو کیا سمجھتے ہو، بھولا بھالا دیکھ کر پھنسا دیا ہے اس بے چارے کو، اس کا بھائی ہے، وہ کیوں کرایہ دینے دیگی بھلا۔ وہ تو لالہ جی کی زندگی میں چیزیں اڑا لیا کرتی تھی۔ یاد ہے وہ ماتا جی کا گلے کا ہار۔ میں کیوں کہہ کر بری بنوں، بھگوان دیکھنے والے ہیں۔ میں اس کی بھلائی کے لئے کہتی ہوں، چھوٹے سے کو پالا جو ہے"

بڑے بھائی نے اخبار اٹھایا پھر رکھ دیا اور بولے "کوٹھی کے اس حصے کا کرایہ کم از کم سو روپے مہینہ مل سکتا ہے۔ آج وہ خالی کریں تو کل ہی لگ جائے۔ ایک دو آدمی مجھ سے پوچھ چکے ہیں"

"اسے خود سمجھ ہونی چاہئے، اب کوئی بچہ تو ہے نہیں" بھابی بولیں "سب سمجھتا ہے۔ میں تو ڈرتی ہوں کہ ان لوگوں کے ہاتھوں پڑ کر سب کچھ گنوا نہ بیٹھے۔ اس سمترا کی نظر اس کی دولت پر ہے۔ لالہ جی کی زندگی میں کہا کرتی تھی۔ لالہ جی ہریش کو بہت چاہتے ہیں، اسے زیادہ دیں گے" سرسوتی دیوی نے دیورانی کی نقل اتاری "پھوپھی تمہیں کاہے کا دکھ ہے" پھر کچھ رک کر بولیں "اچھا، ہریش، زیور وغیرہ کہاں رکھا ہے تو نے اپنے حصے کا؟"

"لاکر میں" ہریش نے جواب دیا۔

بھابی پل بھر کو کسی سوچ میں ڈوب گئیں۔ پھر بولیں "اچھا کیا، وہ جڑاؤ ہار تو ہے نا"

"تمہیں بڑا فکر ہے" بڑے بھائی نے کہا۔

"ہو بھی کیوں نہ، اس کی عادت تو شروع ہی سے بے فکری کی ہے۔ جانتے ہو یہ چھوٹا ہوتا کیا کیا کرتا تھا" سرسوتی دیوی ہنسیں "سندھیا کو چھیڑا کرتا تھا تیرا بیاہ کانے سے کروں گا وہ روتی تھی، تب اسے بہلانے کو کہتا اچھا اچھا، اچھا تجھے جڑاؤ ہار دوں گا"

بڑے بھائی صاحب مسکرا دیئے "وہ سب تو بچپن کی باتیں تھیں اب تو سیانہ ہو گیا ہے۔"

بھابی بولیں "سندھیا ابھی کل ہی کہہ رہی تھی۔ انکل اپنا وعدہ بھول گئے۔"

ہریش اب بور محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اٹھنے کا بہانہ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ اس کا دوسرا بھائی کشن چند اور سمترا دیوی آ گئے۔

"لو یہاں بیٹھے ہو ہم تمہاری طرف گئے تھے" کشن چند نے کہا "تمہاری بھابی کہتی تھی کہ تین چار دن ہو گئے ہریش نہیں آیا چلو چل کر خود مل آئیں"

"اسے خیال ہو نہ ہو مجھے تو ہر دم اس کا فکر لگا رہتا ہے" سمترا دیوی بولیں "اب گلے کا کیا حال ہے؟" پھر وہ سرسوتی دیوی سے مخاطب ہوئیں "پچھلے دنوں اچار کھا کھا کر گلا خراب کر لیا تھا، سو مرتبہ کہا کھانا میری طرف کھا لیا کرو، آ نہ سکو تو نوکر لے جایا کرے گا۔ پر یہ ہیں کہ مانتے ہی نہیں بھلا ایسی بھی کیا ضد۔"

"گلا خراب تھا!" سرسوتی دیوی حیران رہ گئیں "ہائے رام، تو نے بتایا بھی نہیں، میں تجھے الگ نہیں رہنے دوں گی۔ جب تک بیاہ نہیں کر لیتا میرے پاس رہ۔"

"ارے نہیں بھابی، ایسی گھبرانے کی کیا بات تھی، ٹھیک بھی ہو گیا۔"

"غرارے کئے تھے نمک کے، میں نے سمجھایا تھا غرارے روز کیا کر" سمترا دیوی نے پوچھا۔

اب تو کوئی تکلیف نہیں؟" سرسوتی دیوی آگے بڑھ آئیں "آج ادھر ہی رہ جاؤ۔ گھی کی گدی باندھ دوں گی۔"

"ہاں ہاں کیا حرج ہے" سمترا دیوی بولیں "آرام رہے گا" پھر کچھ سوچ کر کہا "میرے بھائی صاحب آج تم سے ملنا چاہتے تھے۔"

ہریش کے جی میں آیا کہہ دے "میں نہیں ملنا چاہتا تمہارے بھائی صاحب سے۔ اور ان سے کہہ دو جگہ خالی کر دیں۔ لیکن وہ کہا نہیں سکا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر ہریش اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھہرو ہم بھی ساتھ چلتے ہیں" سمترا دیوی نے کہا اور نمستے کر کے تیار ہو گئیں۔

سڑک پر چلتے چلتے سمترا دیوی نے مسکرا کر پوچھا "کیا کہتی تھیں تمہاری بڑی بھابی۔ کہتی ہوں گی جگہ خالی کروالو، ان کے بھائی جو آ رہے ہیں یہاں تبدیل ہو کر" خود ہی سمترا دیوی نے جواب بھی دے دیا۔

ہریش چپ چاپ چلتا رہا۔

"تم چاہو تو میں ابھی بھائی بھاوج کو جانے کو کہہ دوں، وہ تو خود بڑے شرمندہ ہیں، کوئی ڈھنگ کی جگہ ہی نہیں ملتی، ابھی کل ہی کہہ رہے تھے۔ کہ کرایہ دلوا دو۔ میں نے ڈانٹ دیا، میں جانتی نہیں اپنے دیور کو، چھوٹے سے کو پالا ہے، وہ بھلا میرے بھائی سے کرایہ لے گا۔ پھر اسے کمی بھی کس بات کی ہے۔ میں نے منع کر دیا ایسا نہ کرنا وہ بُرا مان جائے گا۔ تب کہیں جا کر وہ مانے۔ ویسے تم کہو تو لے دوں کرایہ۔"

ہریش چاہنے پر بھی ہاں نہ کہہ سکا۔

جب وہ لوگ ہریش کی کوٹھی میں داخل ہوئے تو لالہ سوہن لال اپنے کمرے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

ہریش نے اپنا کمرہ کھولا۔ اور اندر جا کر بتی جلا دی۔

سمترا دیوی نے قدم رکھتے ہی کمرے کا جائزہ لیا اور ایسے قدم کھینچ لیا جیسے کانٹا چبھ گیا ہو "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے کمرے کی، یہ آدمیوں کے رہنے کی جگہ ہے یا بھیڑ بکریوں کا احاطہ۔ رام رام نوکر کیا کرتا ہے۔"

ہریش ہنسا "ارے بھابی، نوکر بے چارہ تو تنگ آ گیا ہے۔ قصور سب میرا ہے۔"

"جانتی ہو، جانتی ہوں" سمترا دیوی بولیں "بچپن میں بھی تیرا یہی حال تھا ہڑبونگ مچائے رکھتا تھا، مجال ہے کوئی چیز اپنی جگہ پر مل جائے،

ایک مرتبہ تو نے کھانڈ کے پیپے میں نمک ملا دیا تھا؟ بھابی مسکرائیں۔ "اور پھر تیرا کمرہ، لالہ جی مجھے بلا بلا کر دکھایا کرتے تھے۔ چھوٹی بہو صفائی کرادو۔ چھوٹی بہو اس کے کپڑے ٹھیک سے رکھ دو، تمہیں تو میرے حوالے کر رکھا تھا، انہوں نے۔ ماتاجی کے بعد تو خود انہیں اپنا بھی ہوش نہیں رہا تھا" بھابی نے منہ پھیر کر آنکھوں پر دھوتی کا پلو پھیر لیا اور درد بھری آواز میں بولیں "بے چارے بیماری کی حالت میں پاس بٹھا کر کہا کرتے تھے۔ چھوٹی بہو، بڑی کی عادت تو تم جانتی ہو، ہریش کا دھیان تم ہی رکھنا بھابیاں ماں برابر ہوا کرتی ہیں، پھر ہریش تو تمہارے بنا ایک منٹ نہیں رہتا۔"

ہریش مرحوم باپ کا ذکر سنکر قدرے اداس ہو گیا۔

کشن چند نے بھائی کے پژمردہ سے چہرے کو دیکھا اور بیوی سے کہا "چلو چھوڑو بھی، ہر وقت پتاجی کو ہی یاد کرتی رہتی ہو۔"

"کیا کروں، ایک پل نہیں بھولتے، آخری بار کا دیکھا ہوا چہرہ آج تک آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔"

"بیٹھو بھابی" ہریش نے کہا۔

سمترا دیوی پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

تھوڑی دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر بھابی نے اپنے بھائی کی بڑی لڑکی کو پکارا "کرشنا"

کرشنا بھاگی ہوئی آئی اور دروازے میں کھڑی ہو کر ہنسنے لگی۔

ہریش کو اس کی یہ عادت بہت بری لگتی تھی۔ بات بات پہ ہنسے جا رہی ہے، پوچھو "کہاں جا رہی ہو"

"ہی، ہی، بازار"

"یہ کونسی کتاب پڑھ رہی ہو"

"ہی، ہی ناول ہے"

ہریش جب بھی اس کا ذکر کرتا۔ ہی، ہی، کرشنا، کہہ کر کرتا اور سمترا دیوی مسکرا کر ٹوک دیا کرتیں "ایسے نہیں کیا کرتے۔ تجھے دیکھ کر شرما جاتی ہے"

"کیوں؟" ہریش پوچھتا۔

"بس یونہی" بھابی کشن چند کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتیں اور ہنسنے لگتیں "یہ ابھی بالکل بچہ ہے۔ ارے میں اسے اپنی دیورانی جو بناؤں گی"

"نہیں بھابی" وہ کہتا۔

"یہ اوپر سے نہیں نہیں کر رہا ہے، من میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے" بھابی مسکرائیں۔

کرشنا دروازے میں ہی کھڑی تھی۔

سمترا دیوی نے دیکھ کر کہا "آ بیٹھ جا"

"ہی، ہی" وہ اندر آکر سمٹ کر بیٹھ گئی۔

"تجھ سے میں نے کہا تھا کہ ہریش کا کمرہ صاف کر دیا کر" بھابی بولیں۔

"ہی، ہی یہ کرنے ہی نہیں۔ ہی، ہی، ہی، چابی تو دیتے نہیں!"

"کیوں بھئی!" سمترا دیوی نے اس طرح ہریش کی طرف دیکھا جیسے اسے مجرم ٹھہرا رہی ہوں۔

"یہ کام نوکروں کا ہے بھابی" ہریش نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"تو کہہ دیا کر اس سے سب کچھ کر دیا کرے گی"
"قمیض وغیرہ کے بٹن یہ خود ہی لگا لیتے ہیں بواجی" کرشنا نے جیسے شکایت کی۔
"تو نہیں لگاتی"
"ہی، ہی، نہیں"
سمترا دیوی کے بھائی بھاوج بھی آ گئے۔
ہریش جانتا تھا کہ اب یہ لوگ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گپیں ہانکیں گے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا "ایک کام یاد آ گیا۔ نقصان ہو جاتا۔ اچھا آپ لوگ بیٹھے میں ذرا ہو آؤں"
"کتنی دیر لگاؤ گے؟" بھابی نے پوچھا۔
"تقریباً دو گھنٹے لگ جائیں گے" ہریش نے معصومیت سے کہا۔
سمترا دیوی نے خاوند کی طرف دیکھا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئیں "چلو ہم بھی چلیں"
ہریش باہر نکل گیا اور یونہی ادھر ادھر ٹہل کر واپس آ گیا۔
تین چار دن کے بعد بڑے بھائی کا نوکر اسے بلانے آیا۔ وہ اس کے ساتھ چلا گیا۔
"کہاں رہے اتنے دن" بھابی نے پوچھا۔
"بھابی بس یونہی آ نہیں سکا"
"تم نے تو کہہ دیا آ نہیں سکا۔ اور یہاں میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ پوچھو اپنے بھائی صاحب سے روز نوکر بھیج کر پتہ منگواتی تھی، تم ملتے ہی نہیں" سرسوتی دیوی نے کہا۔ "سیر کے لئے نکل جاتا ہوں" ہریش نے بتایا۔
"ایک بات پوچھوں"
"کیا۔؟"
"جھوٹ مت بولنا۔ تمہاری ماں کی جگہ ہوں" بھابی نے مسکرا کر کہا۔
وہ خاموش رہا۔
"سنا ہے کسی لڑکی سے ملنا جلنا ہو گیا ہے"
ہریش نے پل بھر کے لئے سوچا۔ انہیں کیسے معلوم ہو گیا۔ پھر بولا "نہیں تو، وہ آشا کی بات کر رہی ہو میرے دوست کی بہن ہے، بڑی نیک پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ شک کی تو کوئی بات نہیں"
"شک کی کوئی بات نہیں خاندان کی عزت کا سوال ہے" بھابی سنجیدہ ہو گئیں "پھر یہ لڑکیاں بڑی چالاک ہوتی ہیں، بھولی بھالی بن کر تمہیں پھنسا رہی ہے، جانتی ہے تمہارے پاس روپیہ، پیسہ، زیور، مکان ہے۔ سنبھل کر رہنا، آگے تمہاری مرضی"
ہریش مسکرا دیا "میں ایسا بچہ نہیں ہوں بھابی"
سرسوتی دیوی ایک دم بجھ سی گئیں، پھر پھیکی سی مسکراہٹ سے ہوں کر کے رہ گئیں "اچھا سمترا سے اس دن کیا باتیں ہوئیں"
"کوئی خاص نہیں" ہریش ٹال جانا چاہتا تھا۔

"یہ تو میں کبھی نہیں مانوں گی۔" سرسوتی دیوی بولیں۔ سمترا در کچھ کہے نا۔ کہتی ہوگی جیٹھانی بہت بُری ہے، اس سے بچ کر رہا کر، تیرے روپے پیسے کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ وہ تو لالہ جی کے کان بھرا کرتی تھی۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات تک نہیں ہوئی بھابی۔"

"مجھے بچی سمجھتا ہے۔" بھابی مسکرائیں: "اچھا شادی کی بات کی ہوگی۔"

"بھابی کو کیسے معلوم ہو گیا۔" ہریش نے سوچا۔

"شادی تو میں کرا ہی نہیں رہا۔"

"واہ میں لالہ جی سے وعدہ کر چکی ہوں۔ وہ مرتے وقت کہہ گئے تھے کہ ہریش کا بیاہ، بڑی بہو تم اپنے ہاتھوں سے کرنا۔ بے چاروں کی آتما کو دکھ دے گا کیا۔"

"میں امریکہ جانے کی سوچ رہا ہوں۔ بھابی۔"

"میم لائے گا وہاں سے۔"

ہریش مسکرا دیا۔

"دیکھ ہریش، لالہ جی لڑکی پسند بھی کر چکے تھے۔ وعدہ بھی کر لیا تھا۔ اب تیرا فرض ہے کہ ان کی بات جھوٹی نہ ہونے دے آگے تیری مرضی۔" "کونسی لڑکی۔"

"میری سب سے چھوٹی بہن۔" ایف۔ اے پاس ہے۔ تو نے تو دیکھی ہے۔"

ہریش کو ایک لڑکی کا چہرہ یاد آگیا، جو بھابی سے ملنے آیا کرتی تھی اور دس دس پندرہ پندرہ دن ان کے گھر رہا کرتی تھی، کالی، موٹی، بھدی سی لڑکی۔ جسے مار کٹائی سے بھرپور فلمیں بہت اچھی لگا کرتی تھیں۔ وہ اس کے خیال سے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کس طرح بات ٹلے کہ سندھیا اپنی ایک سہیلی کے ساتھ آگئی

"آؤ بھئی سندھیا، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"لے آگئے تیرے انکل، روز پوچھتی تھی۔ اب لے جا کر ساڑیاں۔" سرسوتی دیوی نے کہا۔

"انکل مجھے ساڑیاں لے دو، اور ایک ہاف کوٹ بھی بنواؤں گی۔" سندھیا نے بچوں کی طرح کہا۔

"لے یاد کرا دیا تو آتے ہی پیچھے پڑ گئی۔" سرسوتی دیوی نے کہا۔ "نہ انکل کو کچھ کھلایا نہ کوفی بنائی۔ آ گئی ساڑیاں مانگنے، جانہیں لیکے دیگا۔"

"ہاں کیسے نہیں لے کے دیں گے، ہم تو خرید لے گے۔" سندھیا مچل گئی۔ "انکل کوفی بناؤں۔"

"تیری چچی، انکل کا بیاہ کرشنا سے کرنے لگی ہے۔" سرسوتی دیوی نے بتایا۔

"سچ انکل۔" سندھیا ہنسی۔ "پھر تو خوب مزا رہے گا۔ چاہے جتنا چھیڑ لو، اسے کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ اُود بلاؤ تو ہے نری انکل برا مت ماننا۔" وہ ہنسی۔ ہریش بھی ہنسنے لگا۔

کوفی پی کر وہ چلا آیا۔ گھر پہونچا تو چھوٹی بھابی اور بھیا آئے ہوئے تھے۔

سمترا دیوی نے دیکھتے ہی کہا۔ "بڑی بھابی سے بڑا پیار ہے۔"

ہریش خاموش رہا۔

"میرے بارے میں کہتی کچھ ہوگی۔"

ہریش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس سوچتا رہا کہ یہ ایک دوسرے پر شک کیوں کرتی ہیں، اور محض شک ہی نہیں، بہت حد تک یہ حقیقت بھی ہے لیکن وہ اپنی زبان سے کچھ کہہ کر بُرا نہیں بننا چاہتا تھا۔ وہ سنتا اور بھول جاتا۔

"اچھا اس نے آرام بھی کرنا ہوگا، مطلب کی بات کرو۔" کشن چند نے کہا۔

"او ہو، تم تو جھٹ اُکتا جاتے ہو، کرے گا آرام، وہی تو ہے جو مجھے سوئی کو جگا جایا کرتا تھا۔ اور جب تک دودھ کی ملائی نہیں کھلاتی تھی تنگ کرتا رہتا تھا۔" سمترا دیوی نے کہا اور ہریش سے مخاطب ہوئیں "کیوں رے چلی جاؤں اٹھ کر۔"

"بیٹھو بھابی، تمہارا ہی گھر ہے۔"

"بس۔" بھابی نے خاوند کی طرف دیکھا اور مسکرا دیں "اچھا ایک بات ہے، بھائی صاحب کرشنا کے بارے میں جلدی کر رہے ہیں۔ اب تو انکار مت کر۔"

"بھابی میں بڑی مصیبت میں ہوں، بڑی بھابی کہتی ہیں ان کی بہن سے کرلوں بیاہ۔"

"وہ کالی کلوٹی، اس سے کرے گا بیاہ، میں سمجھتی ہوں، بڑی تو تیری دولت ہڑپ کرنا چاہتی ہے، ابھی اسی دن کہہ رہی تھیں کہ ہریش سندھیا کے بیاہ میں جڑاؤ ہار اور دس ساڑیاں دے رہا ہے، کیوں سچ ہے۔"

ہریش خاموش رہا۔

"بھئی چچا ہونے کے ناطے جو چاہے دو، لیکن سوچ سمجھ کر چلنا چاہیئے۔ وہ ہار کم از کم پندرہ ہزار کا ہوگا۔ وہ ماں بیٹی تجھے اُتو بنا رہی ہیں۔ آگے تو خود سمجھ دار ہے۔"

ہریش مسکرایا "میں اپنی ساری دولت کسی یتیم خانے کو دیکر سادھو ہونے کی سوچ رہا ہوں۔"

"تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔" سمترا دیوی نے کہا "شادی کرا، آرام سے رہ۔"

"میں ایک اور رائے دوں گا۔" اس مرتبہ بھائی صاحب بولے "تو جانتا ہی ہے کہ میرا کام کافی چلا ہوا ہے، تو اپنا روپیہ دکان میں لگا دے۔ حصہ لینا ہو حصہ لئے جاؤ ورنہ سُود لیتا رہ۔"

"نہیں بھائی صاحب، میں نے فیصلہ کر لیا ہے سادھو ہو جاؤں گا۔"

"کیا۔"

"قسم سے، اس دنیا کو تیاگنا ہی پڑے گا۔" ہریش نے مکمل سنجیدگی سے کہا۔

"اور یہ کوٹھی، دکان، زیور وغیرہ۔" سمترا دیوی نے پوچھا۔

"کچھ دان کر دوں گا اور کچھ۔"

"کچھ کیا۔"

"سندھیا کے بیاہ پر خرچ کر دوں گا، اور میرا ہے بھی کون۔"

"ہاں بھئی ٹھیک ہے، آج سندھیا اور اس کی ماں اپنے ہو گئے، ہم غیر ٹھہرے، سن لیا۔" سمترا دیوی نے خاوند سے کہا۔

"بچوں کی طرح پالا ہے تجھے اور ہم غیر، وہ جو بات بات پر مارنے دوڑا کرتی تھی وہ اپنی۔"

"ارے بھابی کچھ انہیں کو تھوڑا ہی دے جاؤں گا۔ رما کے لئے بھی چھوڑ جاؤں گا۔"

"جانے دے" سمترا دیوی مسکرائیں۔

"اچھا اب ہم چلتے ہیں" بھائی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

ہریش ان کے جانے کے بعد بستر پر پڑا پڑا اینٹھتا رہا پھر آشا کے بھائی کو ٹیلیفون کیا۔ "سنو رندھیر میں نے فیصلہ کر لیا ہے، اسی ہفتہ آشا سے شادی کر رہا ہوں" "نہیں کوئی رشتہ دار نہیں آئے گا۔ ویسے میں سب کو اطلاع دوں گا۔ نہیں یار، ڈر کی کیا بات ہے وہ لوگ کیا کریں گے، تم فکر نہ کرو"

دوسرے روز جب ہریش نے بڑے بھائی کے ہاں فون پر اطلاع دی تو سرسوتی دیوی نے فوراً سمترا کو ٹیلی فون کیا "سنا کچھ، ہریش اس ماسٹر کی لونڈیا سے شادی کر رہا ہے"

"ہاں میں نہ کہتی تھی وہ چالاک ہے، ہمارے سامنے سیدھا بنا رہتا ہے" سمترا نے کہا "میں آ رہی ہوں"

تھوڑی دیر بعد جیٹھانی کے گھر پہنچ گئی۔

"گو موت ہم نے کیا۔ آج ہمیں پوچھا تک نہیں" سرسوتی دیوی بولیں۔

"میں نے ایسا برا آدمی کبھی نہیں دیکھا" سمترا دیوی بولیں۔

وقار بن الہٰی — نگارش (کراچی)

کالی عورت

آخری گاڑی کے نکلنے میں چند منٹ ہی رہ گئے تھے۔ میں نے اپنی سیٹ سے اٹھ کے ڈرائیور سے ملتجانہ لہجے میں کہا بھی کہ اگر وہ چلے نہیں کم از کم وقت پر ہی ہمیں اسٹیشن پہنچا دے یہ لہجہ یوں اختیار کیا تھا کہ مجھے اگر اکیلے میں اسٹیشن پر رات گزارنی پڑ جائے تو پروا نہیں ہوتی۔ الٹا خوش ہوتا ہوں۔ پلیٹ فارم کے کسی تنہا بنچ پر لیٹ کے آنکھیں بند کر کے گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیں کان میں پڑتی ہیں تو بڑا لطف آتا ہے۔ لیکن ایسے عالم میں جب بیوی بھی ساتھ ہو اور بیوی بھی ایسی کہ جس نے زندگی میں پہلی بار گھر سے باہر قدم رکھا ہو تو پریشان ہونا اور التجا کرنا قدرتی بات تھی۔ پھر گاڑیوں کے اوقات تھے بھی تو بے ڈھنگے، اس کے بعد دوسری گاڑی کہیں آدھی رات کو گزرتی تھی، بیوی کے ساتھ اتنی رات گئے تک کسی مسافر خانے میں اونگھنا مجھے صاف بیوقوفی لگ رہی تھی، پھر ڈرائیور لوگ تو اسٹیرنگ سنبھال کے جیسے شہنشاہ ہو جاتے ہیں کم بخت نے بات کو سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا۔ بڑے آرام سے ہر قدم پر رکتا اور چلتا رہا اور جب وہ اسٹیشن کے قریب پہنچا تو گاڑی وارنر سگنل سے بھی آگے بڑھ گئی تھی، غصہ تو بہت آیا لیکن میں اس کا بگاڑ بھی کیا سکتا تھا۔

امینہ کو لئے میں پلیٹ فارم پر تو چلا آیا۔ لیکن وہاں تو اس شدت کی خاموشی تھی کہ کوئی کتا بھی بھونک نہ رہا تھا۔ مجھے یہ خیال اور زیادہ ستانے لگا کہ یہ بیوی نہیں، مکمل سرکس ہے جسے سنبھالنا میرے جیسے لاپروا شخص کے لئے خاصا کٹھن کام ہے۔ خود تو ایک بیگ لے کر شہر گھومنے کی عادت تھی لیکن اتنا بڑا بیگ کہاں سے لاتا جس میں وہ اپنی پوٹلی اور میرے اٹیچی سمیت سما جاتی، یوں لگتا تھا جیسے میں ابھی اپنا سر پیٹ لوں گا کہ ۔۔۔ اتنے میں پیچھے سے بڑی بھدی آواز آئی۔

"جناب اگلی گاڑی میں تو ابھی بہت ٹیم ہے۔ آپ کو ضرورت ہو تو ویٹنگ روم کھول دوں۔" میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ آواز تو خیر پھر قابل برداشت تھی لیکن شکل سخت واہیات) جیسے دودھ بغیر کالی چائے، میرے سامنے ایک سیاہ رنگ کی قدرے پھیلی ہوئی عورت کھڑی تھی۔ جس کی آنکھیں میلی تھیں۔ اور جس کے ہاتھوں میں یہ بڑا سا چابیوں کا گچھا تھا۔ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ اس کے ساتھ ہو لیا، اس نے جالی کا دروازہ کھول کے پہلے قفل اتارا اور پھر دروازہ دھکیل کے رک گئی لیکن دروازے کے قریب جا کے ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف کچھ ایسی خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا جیسے ویٹنگ روم نہیں پھانسی کا کمرہ ہے کہ جو بھی اندر جائے گا شکار ہو جائے گا۔ ہم حق بجانب یوں تھے کہ سارا اسٹیشن بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ کبھی کبھار کوئی قلی مردہ سے قدموں سے جاتا دکھائی دے جاتا۔ نہیں تو دور تک کوئی دوسرا انسان دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ اس ویٹنگ روم میں میری بیوی ہی جا سکتی تھی۔ میں نہیں۔ اور اکیلے میں تو اس بھلے مانس کا دم گھٹ جاتا ہمیں اس گومگو کی کیفیت میں دیکھ کے اس کالی عورت کے بھدے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔

"اس کے بعد تو شاید ہی کوئی پسنجر آئے جناب آپ بھی ساتھ ہی بیٹھ جائیں۔" امینہ اور میں پوٹلی اور اٹیچی کیس سنبھالے اندر چلے گئے۔ وہ عورت بھی پیچھے پیچھے چلی آئی۔

"بڑا خراب وکت ہے جی کا ٹسی کا۔ آدھی رات تک کون انتجار کرتا رہے۔ آپ کے لئے چائے لاؤں" امینہ نے برقعہ اتار کے ڈریسنگ ٹیبل پر پھینک دیا اور کچھ اس طرح مانوس سی ٹہلنے لگی، جیسے یہ ویٹنگ روم اس کے گھر کا ایک کمرہ ہے۔ کرسی پر لیٹے کے میں نے جواب دیا۔ "نہیں بھئی۔ فی الحال تو ضرورت نہیں۔ تمہاری ڈیوٹی کے بجے ختم ہوتی ہے؟" چابیوں کا گچھا پہلو کی جیب میں ڈال کے بڑے چمکتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"ڈیوٹی تو چھ بجے ہی کھتم ہوگی۔ پر آپ کے لئے جیادہ دیر بیٹھ جاؤں گی، یوں بھی اس کمرے کے اور گرد جندگی کا اتنا بڑا حصہ گجار لیے کہ اب یہ بھی اپنا گھر ہی لگنے لگا ہے۔" واپس جاتے ہوئے اس نے کمرے کی لائٹ آن کی اور دروازے کے اندر ہی چپ چاپ بیٹھ گئی۔ مجھے ناگوار سا محسوس ضرور ہوا لیکن کہہ نہیں سکا۔

اس کالی اور بے ڈھنگی سی عورت کو نظر انداز کر کے میں امینہ سے باتیں کرنے لگ گیا۔ میں اسے اپنے اس دوست کے گھر اور بیوی بچوں کے متعلق بتا رہا تھا کہ جس کے پاس ہم جا رہے تھے۔ چند لمحے تو وہ بڑے اطمینان سے سنتی رہی۔ لیکن پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کچھ بے چین سی ہے۔ کچھ گھٹی گھٹی سی ہے۔ کبھی ایک ہاتھ کو گلے تک لے جاتی ہے اور نکلیس پر اسے پھیرنے لگ جاتی ہے اور کبھی دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی بندیا کو ٹٹولنے لگ جاتی ہے۔ اس کے اضطراب کی تہہ تک پہنچنے کے لئے میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو وہ کالی عورت ہی کو دیکھے جا رہی تھی۔ اور اس نے یوں امینہ کے چہرے پر نگاہیں پھیلا رکھی تھیں جیسے دونوں کی علیک سلیک ہو۔ البتہ اس کی کسی قدر پیچھے ہٹی ہوئی اور زرد آنکھوں میں ناتمام حسرتیں تھیں اور امینہ کے ہاں ہلکا سا خوف، میری باتوں کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا۔ اور اب میں بھی اُسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔

جل تھل سے جسم والی کالی عورت کی عمر کوئی چالیس کے لگ بھگ ہوگی، رنگ کے متعلق پہلے کہہ چکا تھا۔ مگر اس کے نقش پیارے ضرور تھے۔ جوانی میں وہ یقیناً ایک قیامت برپا کرتی رہی ہوگی۔ آنکھوں میں گہرائی ضرور تھی، اس قدر کہ بھری عمر میں اُس نے جس کی طرف دیکھا ہوگا، بیچارہ ٹھٹک گیا ہوگا۔ میرا اپنا یہ عالم تھا کہ اگر چند ماہ پہلے دکھائی دے جاتی تو ــــ کیا ہو جاتا۔ کپڑے اس کے واجبی سے تھے، البتہ آنچل اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ اگر ذرا بھی سرک گیا تو اس کی پارسائی ختم ہو جائے گی۔ پر ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ آخر وہ اتنی غور سے امینہ کے زیوروں کو کیوں دیکھے جا رہی تھی۔ اس بھلے مانس سے کہا تھا کہ زیور پہن کے نہ جاؤ، پر وہ نمائش چھوڑ دیتی تو اسے عورت یا سرکس کون کہتا۔ فرار کی راہ ایک ہی سجھائی دی۔ اور میں نے اسے چائے لانے کا کہہ دیا۔

بڑی بے دلی سے دروازہ کھول کے جب وہ باہر نکل گئی تو میں نے دیکھا کہ امینہ کے چہرے پر اطمینان ہولے ہولے لوٹتا چلا آرہا تھا۔

"توبہ! ظالم اس طرح گھورتی ہے جیسے کچا کھا ہی تو جائے گی۔"

پر مجھے امینہ کی رائے سے شدید اختلاف تھا۔ وہ نہیں تھی۔ اس کی نگاہوں میں لالچ پھر بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے اسے اپنا وقت یاد آ گیا ہو یا ہو سکتا ہے اس کا کوئی زخم پھر کھل اٹھا ہو۔ آخر۔ ہماری بات وہیں رک گئی۔ وہ چائے اٹھائے چلی آرہی تھی۔ ہم ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگ گئے۔ ٹرے ہمارے سامنے رکھ کے وہ پھر دروازے میں جا بیٹھی اور ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑتے اور میل کی سوتیاں بناتے ہوئے بڑے شرمندہ سے لہجے میں کہنے لگی۔

"صاب۔ بیگم صاب ناراض تو ضرور ہوا ہوگا۔ پر ان کا اتنا اچھا زیور دیکھ کے مجھے اچانک ایک بھولی بسری یاد آ گئی تھی، ورنہ میں کبھی اتنے گور سے نہ دیکھتی۔ معافی کر دیجئے۔"

ہاتھ روک کے میرا جی چاہا بھی کہ اُس سے وہ بات پوچھ ہی لوں۔ لیکن جانے اسے کیا یاد آ گیا کہ ایک دم اٹھی اور لپک کے باہر نکل گئی۔ باہر تاریکی بڑے پیار سے پٹڑیوں سے بغل گیر ہو رہی تھی۔ اور پلیٹ فارم پر روشنیوں کا ایک سیلاب امنڈا ہوا تھا۔ پرے بہت دور گیدڑوں نے شبد کلیان شروع کر دیا تھا۔ ہم دونوں چائے پینے لگ گئے۔

آخری بسکٹ پر کافی تکرار ہوئی۔ میں اپنے ہاتھ سے امینہ کو کھلانے پر بضد تھا اور وہ بچوں کی طرح روٹھ رہی تھی کہ دن دہاڑے ایسی بے شرمی ہرگز برداشت نہیں کرے گی۔ کہ دروازہ کھول کے وہی کالی عورت اندر آئی۔ اور دروازے ہی میں بیٹھ گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف مسکرائی نگاہوں سے دیکھ کے چپ ہو رہے۔

چپ ہو رہے۔

"سچ مجھے وہ لڑکی یاد آگئی ہے کہ جو آج سے لگ بھگ پندرہ بیس برس پہلے یہاں آئی تھی۔ اس کے بدن پر بھی ایسا ہی جیور تھا اور وہ بھی بیگم صاب کی طرح کامنی سی تھی۔ پھر میں ہی ان کے لئے چائے لائی تھی اور" ہم نے اس کی طرف توجہ نہیں دی کہ بات اگر آپ ہی آپ شروع ہو گئی ہے تو وہ اسے ختم کئے بغیر نہیں رکے گی۔ ہمارا وقت ہی کٹ جائے گا۔ ہم اطمینان سے چائے کی چسکیاں لیتے رہے۔ اس نے لمحہ بھر کے لئے باہر تاریک پٹڑی پر کھڑے نیم روشن مال کے ڈبوں کو دیکھا اور کہنے لگی۔

"مجھے نوکری میں آئے بس تھوڑے دن ہی ہوئے تھے، اور ان دنوں میرا جمانہ بھی تو اور تھا۔ میں بہت جلدی ڈیوٹی ختم ہونے سے پہلے ہی گھر چلی جایا کرتی تھی۔ پر ایک شام آپ ہی کی طرح کا ایک جوڑا الیس سے بہت دیر سے پہنچا، اور وہ اسی کمرے میں گاڑی کا انتجار کرنے لگ گیا تھا۔ نوجوان بے حد کھوبصورت تھا، صاب آپ سے بڑھ کے اس کی آنکھیں تو مجھے آج تک نہیں بھولیں۔ اتنی موٹی اور ایسی پیاری تھیں کہ کیا کہوں آپ سے۔ سچی بات ہے رشک کے مارے تو میں جل گئی۔ اس لڑکی کو اتنا کھوبصورت کھاوند جو ملا تھا۔ لڑکی اس سے کم نہ تھی۔ مجھے اس کا چہرہ یوں دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے انجن کے ماتھے پر جلتی روشنی مجھے تو بڑا سا لیمپ لال ہو کے رہ جائے، پر صاب! پتہ نہیں کیا بات تھی کہ وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف ابل رہا تھا۔ جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ وہ دونوں باہر جالی کے درواجے کی طرف دیکھتے رہے اور کبھی کبھار ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتے تو لڑکی کی نگاہیں فوراً جھک جاتیں مجھے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ عمر بھی تو اس کی یہی کوئی اٹھارہ بیس برس تھی۔ میں نے سوچا۔ شادی کے بعد دونوں کو پہلی بار یوں اکیلے مل بیٹھنا نصیب ہوا ہے۔"

ہماری حالت یہ تھی کہ ہم یہ بھول چکے تھے کہ چائے پینے کے لئے منگائی گئی ہے۔ ٹھنڈی کر کے باہر پھینکنے کے لئے نہیں میں پھر ایک آدھ چسکی لے لیتا تھا لیکن آمینہ کی چائے تو ویسی ہی رکھی تھی، ایک وہ کم بخت ہے اس قصے کو اتنی دلچسپی سے بیان کرنے لگ گئی تھی، جیسے اس کی آپ بیتی ہی تو ہو۔ میں چپ کا رہا اسی بہانے وقت کٹ رہا ہے۔

"پھر صاب!" اس نے سپاٹ سی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسالیں اور انہیں گھٹنوں پر رکھ کہنے لگی "انہوں نے مجھے چائے لانے کو کہا۔ تو میں ریفرشمنٹ روم میں چلی گئی۔ راستے میں میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جب تک گاڑی نہیں جاتی میں بھی نہیں جاؤں گی۔ وہ لڑکی تو جیسے میرے سینے میں چپ کے بیٹھ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں گرم چائے لی آئی۔ تو وہ اسی طرح بیٹھے باتیں کر رہے تھے، میرا جی چاہا تھا کہ چند لمحے کمرے میں ہی رک کے جی بھر کے لڑکی کی طرف دیکھوں۔ لیکن جب میں نے نوجوان کی گود میں چند ٹوٹے ہوئے لمبے لمبے بال دیکھے تو سب کچھ سمجھ کے باہر نکل آئی۔ اور وہیں بنچ پر بیٹھ کے روشنی میں منڈلاتے ہوئے پتنگوں کو دیکھنے لگی۔ وہ چائے پینے کے ساتھ ساتھ کن قدر اونچی آواز میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے، میں پھر کچھ سن سکی کہ نوجوان کہیں شہر میں نوکر تھا۔ اور اب وہ وہاں جا کے اپنا گھر بسانے کے متعلق باتیں کر رہے تھے میں نے سوچا شادی ان کی شاید چند دن پہلے ہوئی ہے۔ لیکن ان کے پاس سامان تو تھا ہی نہیں۔ البتہ کبھی کبھی ان کی آواج اتنی دھیمی ہو جاتی کہ میں کوشش کے باوجود نہ سن پاتی۔ مجھے غصہ بھی آتا اور ہنسی بھی کہ وہ کوئی مجھے سنانے کو تو باتیں نہیں کر رہے ہیں برتن لینے اندر گئی تو لڑکی اپنے جیور اتار تی جا رہی تھی اور رومال میں رکھ رہی تھی۔ اس وقت صاب کی نگاہوں میں جلنے کیوں سوائے لالچ کے کچھ بھی تو نہیں جھلک رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو روکا بھی لیکن پھر ضبط نہیں ہو سکا۔ "بی بی یہ جیور تو تجھے بہت اچھے لگتے ہیں انہیں اتار کیوں رہی ہے تو ——؟" نوجوان نے جواب دینے میں پہل کی "اصلی زیور تو زندگی کی خوشی ہے پگلی۔ یہ تو نقلی زیور ہیں۔" میں نے جواب نہیں دیا۔ برتن اٹھا کے باہر نکل گئی اور —— آپ کے لئے چائے اور لاؤں ——؟" ہم دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور پھر جلدی سے بدحواسی پر قابو پاتے ہوئے میں نے کہا۔

"نہیں بھئی —— تم نے پہلے بھی کون سی ہمیں پی لینے دی ہے ——" وہ ہنس دی۔ میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا اٹھ کے کوچ پر آلیٹا۔ امینہ وہیں بیٹھی سنتی رہی۔

"میں بھی کیا بکواس لے بیٹھی ہوں، آپ کو چائے بھی نہیں پینے دی۔ تو میں جب برتن دے کے آئی تو وہ صاب باہر کھڑا تھا۔ مجھ سے سرگوشی میں کہنے لگا کہ کسی کام سے وہ بازار تک جا رہا ہے۔ میں اتنی دیر تک بیگم کا خیال رکھوں۔ اور یہ کہہ کے کہ وہ واپسی پر مجھے خوش کر دے گا۔ پھر جب وہ پلٹے کو مڑا تو بھرپور تیز روشنی میں گیا تو میں نے دیکھا کہ جیبوروں سے بھرا رومال اس کے ہاتھوں میں لٹک رہا تھا۔ میرا دل جیسے دھک سے رہ گیا۔

تھوڑی دیر تو میں وہاں باہر بیٹھی رہی پھر ضبط نہ ہو سکا اور دروازہ کھول کے اندر چلی گئی وہ لڑکی پریشان بھی تھی۔ اور مطمئن بھی۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سے وہ چونک اٹھی، ہڑبڑا کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے دیکھ کے وہ جھینپ سی گئی اور اپنے آنچل کو انگلی کے گرد لپیٹ کر بیٹھ گئی لیکن اس کے جسم کا سارا خون جیسے اس کے چہرے پر ہی سارا اکٹھا ہو گیا تھا۔ اگلے چند ہی لمحوں میں اس نے مجھ سے نزدیک کے سارے گاؤں کے فاصلے اور وہاں سے آنے والی بسوں کے اوقات پوچھ لئے۔ مجھے بھی علم یوں تھا کہ اکثر مسافر آتے تھے، اور میں نے ان کی باتوں سے اندازہ کر لیا تھا۔ جب میں اسے بتا چکی کہ چٹا وال سے آنے والی بس ڈیڑھ گھنٹہ پہلے آ چکی ہے اور یہ گاؤں یہاں سے پورے بیس میل ہے تو اس نے اطمینان کا یوں رکا رکا سانس لیا جیسے وہ اسے ظاہر نہ کرنا چاہتی ہو۔" باہر سے کسی قلی نے آواز دی تو میدانی علاقے میں بہنے والی ندی کی طرح یہ کہانی آپ ہی آپ رک گئی۔ اس کالی عورت نے معذرت طلب نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور پھر دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔ امینہ ہم دونوں کچھ اس طرح گم سم بیٹھے تھے جیسے ہماری بپتا بیان کی جا رہی ہو اور ہم اگر بیتاب تھے تو اپنی کہانی کا انجام سننے کے لئے ——— امینہ نے چونک کے کہا۔

"مجھے تو یوں لگتا ہے۔ جیسے وہ لڑکی یہ خود ہی ہو ———" مجھے ہنسی آ گئی۔

"سچ کہا ہے کسی نے کہ عقل بڑی یا بھینس۔ پگلی! اس نے یہ سب اتنے قریب سے دیکھا ہے، متاثر تو ہو گئی ہے۔" باہر کسی مال گاڑی کے ڈبے ڈکا ڈک، ڈکا ڈک بھاگ رہے تھے، اس مرتبہ واپس آ کے اس نے کہا۔

"مجھے خود نہیں معلوم صاب آخر میں کیوں اتنی تفصیل سے یہ سب کچھ آپ کو سنائے جا رہی ہوں۔ شاید اس لڑکی کی بدولت یا ——— تو صاب! بڑی مشکل سے اور میرے لاکھ دلاسوں کے بعد وہ لڑکی مان گئی کہ اسے اپنے گاؤں کے اس لڑکے سے محبت ہو گئی تھی اور چونکہ اسے یہ پتہ تھا کہ اس کی شادی تو ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ پہلے ہی سے کسی اور کے ساتھ منسوب ہو چکی تھی، بلکہ اب تو رخصتی میں بھی چند ہی دن رہ گئے تھے، سو اس نے اپنے جہیز کا جیور اور ماں باپ کی پونجی سمیٹی اور بھاگ آئی، نوجوان شہر میں نوکر ہو گیا تھا۔ اور اب وہ شہر جاتے ہی اس سے شادی کرنے والا تھا۔ اور پھر صاب وہ تو جھینپ کے چپ ہو گئی لیکن میرے تو جیسے پاؤں تلے سے جمین سرک گئی، مجھے پتہ تھا کہ اس قسم کے ایک دو نہیں سینکڑوں واقعات ہو چکے ہیں، اکثر ہوتا ہے کہ معصوم اور بھولی بھالی لڑکیاں ان شیطانوں کے چنگل میں پھنس جاتی ہیں۔ اور پھر کہیں کی نہیں رہتیں ——— میرا دل لرز رہا تھا۔ میں نے سوچا کتنی معصوم سی لڑکی ہے اور بیچاری کو کیسا فریب دیا جا رہا ہے۔ مرد ہوا ہی کس کا ہے۔ مجھے پتہ ہے وہ جیور لے گیا ہے بیچ کر روپیہ اکٹھا کر لے گا تو کبھی لوٹ کے نہیں آئے گا۔ مرد کی یہی تو بری عادت ہے کہ کلی مرجھا جائے تو اسے مسلنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ میں نے چاہا بھی کہ اسے اپنی ان ساری سوچوں سے آگاہ کر دوں۔ لیکن بھولے سے چہرے کو دیکھ کے ہمت نہ پڑتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تو کہنے لگی کہ وہ جیور بیچنے گئے ہیں پھر جیسے اسے بھی میرے خدشوں کا علم ہو گیا۔ کہنے لگی بہناں! پھکر نہ کرو۔ مجھے ان پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا اس بات پر کہ صبح سورج ضرور طلوع ہو گا۔ اور پھر دوسری صورت میں میں اپنی حفاجت کر سکتی ہوں؛ اس نے گریبان میں ہاتھ ڈالا شاید کوئی چاقو وغیرہ تھا۔ لیکن اس نے دکھایا نہیں۔ خالی ہاتھ باہر نکل آیا۔ میں اس کے اندھے اعتماد پر لرز گئی۔ عورت کا یہی اندھا اعتماد ہی تو ہوتا ہے۔ جو اسے دھوکا دے جاتا ہے۔ اور پھر ——— میں چپ سی اٹھ کے باہر چلی آئی ——— پکی بات ہے جی، مرد اور اس کی محبت چاہت کا کیا اعتبار ابال سمجھ لیجئے یا جھاگ ——— آپ کی مرجی ———"

میں نے کن انکھیوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی گہری اور تیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی، جیسے پوچھنا چاہتی ہو کہ کہیں میری محبت بھی تو محض دکھاوا ہی نہیں کہیں وہ بھی جھاگ ہی تو ثابت نہ ہوگی، پر اب میں اسے کیسے سمجھاتا کہ میں اسے بھگا کر نہیں لایا۔ وہ تو میرے ———

لادی گئی ہے۔

"میں باہر بنچ پر بیٹھی تھی اور وہ لڑکی بار بار آ کے دروازے میں جھانک جاتی تھی۔ جیسے خدشوں کی آگ اس کے دل میں بھڑک چکی ہو۔ میں دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی کہ اچانک وہی نوجوان پلیٹ فارم کی تیز روشنی میں تیز چلتا ہوا مجھے دکھائی دیا۔ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ پھر میں نے اٹھ کے جلدی سے درواجا کھول دیا اور جب وہ اندر چلا گیا تو میں جالی میں سے جھانک کے دیکھنے لگی۔ لڑکی دوڑ کے اس سے لپٹ گئی اور اس کے کندھے پر سر رکھے سسکیاں بھر رہی تھی، اور وہ بڑے پیار سے اس کے بکھرے ہوئے بال سنوار رہا تھا، میں نے ہٹ کے سوچا۔ پانچوں انگلیاں برابر بھی تو نہیں ہوتیں۔

گاڑی آنے میں بس چند ہی لمحے رہ گئے تھے، لیکن سارے پلیٹ فارم پر دو چار مسافر دکھائی دے رہے تھے۔ ٹکٹوں والی کھڑکی ہمیشہ کی طرح ویران لگ رہی تھی۔ گاڑی جب قریب آ گئی تو وہ دونوں باہر نکل آئے اور نوجوان روپے کا ایک نوٹ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ میری اب بھی اس لڑکی کا ہی تعاقب کر رہی تھی۔ گاڑی رکی تو نوجوان نے جنانہ ڈبہ کا درواجا کھول کے اسے اندر بٹھا دیا اور خود ساتھ کے ڈبے میں بیٹھ گیا۔ لیکن جب گاڑی چلنے لگی تو مجھے لگا جیسے کہ سیٹ پر جس پر وہ پہلے بیٹھی تھی، اب وہاں نہیں ہے۔ شاید اس نے جگہ بدل لی ہے۔ اتنے میں گاڑی چل دی اور پھر تھوڑی ہی دیر میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔"

امینہ گو تھک چکی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر تجسس اتنا زیادہ تھا جیسے وہ ایک ہی جست میں اس کالی عورت کی کہانی کے انجام تک پہنچ جانا چاہتی ہو۔ میں خود اٹھ کے ذرا سنبھل کے بیٹھ چکا تھا اور بڑے انہماک سے عورت کی طرف دیکھتا رہا۔

اسٹیشن پر جب ویرانی چھا گئی تو میں درواجا بند کرنے کے لئے مڑی کہ بہت دیر ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی درواجا بند کر کے میں نے قفل میں چابی ڈالی تھی کہ کوئی ہولے سے پاس آن رکا۔ میں نے جھٹ پلٹ کے دیکھا وہی نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہ تھا کہ جس کے سہارے میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔ میرے تو جیسے سارے بدن میں لہو نہ رہا تھا۔ وہی ہوا نا کہ جس کا مجھے ڈر تھا۔ جالم اس پاگل کو دھوکہ دے کے ڈبے کی دوسری طرف اتر گیا تھا۔ اور مجھے کیا بتایا تھا اس نے ـــــ؟ کہ "وہ اپنے ماموں کے ساتھ چلی گئی ہے اور میں کچھ سامان لینے کو رک گیا ہوں۔ اب صبح کی گاڑی سے جاؤں گا۔" درواجا کھول کے وہ اندر گیا لائٹ آن کی اور درواجا یوں ہی بھیڑ کے لیٹ گیا۔

"میں بڑی دیر تک درواجے میں ہی بیٹھی رہی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ مجھے تو اس وقت اپنے آپ سے بھی ڈر لگ رہا تھا، ورنہ میرا بس چلتا تو میں اسے کچا چبا جاتی ـــــ ایک معصوم لڑکی کو دھوکا دینے اور اس کی جندگی سے کھیلنے کے بعد اسے جینے کا بھلا کیا حق تھا، اب پتہ نہیں وہ بیچاری کن راکھشوں کے ہتھے چڑھ جائے گی۔ اور ـــــ میں نے یہی سوچا کہ ریلوے پولیس کو اطلاع کر دوں، اور نہیں تو وہ ٹیلیفون کر کے لڑکی کو اگلے اسٹیشن پر اتار تو لیں گے، کم از کم اس کی عجت تو بچ جائے گی۔ میں نے ابھی دو چار ہی قدم اٹھائے تھے کہ جیسے میرے اوپر سے گاڑی گزر گئی۔ پہلے تو خون ہی خشک ہوا تھا۔ اب تو حواس بھی جاتے رہے تھے، کیا دیکھتی ہوں کہ وہی لڑکی بھاگی چلی آ رہی تھی، اس کا نیا ریشمی برقعہ پھٹ گیا تھا۔ اور وہ سر سے پاؤں تک گرد میں اٹی ہوئی تھی، اس کی ٹھوڑی کے نیچے کافی بڑا زخم تھا جس سے خون بہہ رہا تھا اور اس کی پھولدار قمیص کو اور بھی رنگ رہا تھا اس نے چلتی ہوئی گاڑی سے چھلانگ لگا دی تھی، اور ہانپتے ہوئے وہ میرے پاس آن رکی اور پوچھنے لگی۔ "وہ اندر ہی ہے نا؟" مجھ میں اس وقت اس تماشہ کو دیکھ دیکھ کے جواب دینے کی طاقت بھی بھلا کہاں تھی، میں نے صرف سر ہلا دیا۔ لڑکی نے رک کے پہلے اپنے سانس درست کئے اور پھر آواج نکالے بگیر درواجہ کھول کے اندر چلی گئی۔ اور روشنی آن کر دی۔ میں اس وقت جالی سے لگی کھڑی تھی۔ جیسے کوئی مٹی کا بت کھڑا ہو۔ تیز روشنی جب اچانک ہی کمرے میں تیرنے لگی تو نوجوان نے کروٹ بدلی، لیکن وہ بات بات پر شرما جانے والی لڑکی تو جیسے طوفان بن گئی تھی۔ اس نے نوجوان کو اٹھنے کی فرصت نہیں دی۔ لپک کے ایک ہاتھ مجبوطی سے اس کی چھاتی پر رکھا اور دوسرے سے کوئی بالشت بھر لمبا چاقو اس کے پیٹ میں اتار دیا۔ اس نے چیخ بھی تو نہیں نکلنے دی۔ فوراً ہی چھاتی والا ہاتھ نوجوان کے منہ

پر چلا گیا۔ اور دوسرا ہاتھ یوں گھوم رہا تھا جیسے تربوز کی پھانکیں کاٹ رہا ہو۔ نوجوان نے ایک دو مرتبہ ٹانگوں کو پٹخا بھی لیکن پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔ لڑکی نے اس مرے ہوئے نوجوان کے چہرے پر جور سے تھوک دیا۔ چاقو وہیں پھینکا اور پھر بھاگ کے پل بھر میں کہیں غائب ہو گئی۔ سچی بات ہے صاب! اس لڑکی کا پولیس آج تک سراغ نہیں لگا سکی"

وہ کالی عورت ابھی تک وہیں بیٹھی تھی۔ میں نے فوراً پلٹ کے امینہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں تو پتھر بن گئی تھیں اور وہ بہت زیادہ متاثر نظر آتی تھی، میرے اپنے سارے بدن پر رعشہ طاری تھا۔ مجھے علم تھا کہ اگر وہ کچھ دیر بھی اور بیٹھی تو امینہ بیہوش ضرور ہو جائیگی۔ میں نے اسے آواز دی کہ برتن اٹھا کرلے جائے اور پھر گاڑی کے آنے تک باہر ہی بیٹھے۔ اپنی آنکھیں صاف کرتی ہوئی وہ اٹھ آئی۔ جب وہ برتن اٹھانے لگی تو اچانک میری نگاہ اس کی کالی جلد سے ٹکراتی ہوئی اس کی ٹھوڑی کے نیچے چلی گئی۔

وہاں کوئی ڈیڑھ انچ لمبے اور گہرے زخم کا نشان صاف دکھائی دے رہا تھا۔

غیاث احمد گدی

ادبِ لطیف (لاہور)

بدصورت سیاہ صلیب

پھر یوں ہوا کہ دن بھر کی جلی بھُنی دنیا یکایک گھنگھور گھٹاؤں کے چھا جانے کے باعث ٹھنڈی پڑ گئی۔ اور پھر ٹوٹتے ہوئے دن کے سمے بارش نے تو اور بھی فضا کو خوش گوار کر دیا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا مغربی دریچے سے اندر آیا جس کے باعث ڈی سوزا کے گرم جسم نے ایک طراوٹ سی محسوس کی ریڑھ کی ہڈی کے درمیان دیر سے پھنسا ہوا پسینے کا ایک قطرہ ڈھلک گیا اس کے دل میں ایک دل نواز سی سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو ریشم کے سُبک جھولے پر ایک پینگ سی کیفیت میں محسوس کیا۔ عین اسی وقت گھڑی نے چار بھی بجائے۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے محسوس کیا گویا قدرت آج اُس پر کچھ مہربان ہے۔

شام کی ذرا سی بارش بھی کتنی خوش گوار ہوتی ہے۔ ساری فضا زندگی بکھیر دیتی ہے۔ رُوح میں گُدگُدی پیدا کر دیتی ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر سڑک کے دونوں طرف درختوں کی قطار کو دیکھا۔ ننھے ننھے پتے ہوا کے جھونکوں سے ایک والہانہ رقص میں محو تھے۔ کہیں کہیں پتوں پر بارش کا ایک آدھ قطرہ موتیوں کی طرح سنہری دھوپ میں جھلملا رہا تھا۔ ہوا شاخوں سے سرگوشیوں میں معروف تھی۔ کوئی شریر جھونکا اس کی زلفوں کو چھیڑ جاتا تو وہ آپ ہی آپ شرما جاتی۔

"ہلو سوزا—!"

ایک بڑے سے درخت کے نیچے مارگریٹ، ڈولی اور فینی شوخ رنگ کے کپڑوں میں ملبوس بے حد خوش، بے حد مخمور بس کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ آج اس موسم سے لطف اندوز ہونے کا پورا امکان ہے۔ اور یہ رومان پسند لڑکیاں کہیں چوک سکتی ہیں۔

"ہلو ڈارلنگز" خلافِ دستور وہ چہک کر شوخی سے بولی۔ "کیا تمہارا کچھ کھو گیا ہے، جس کی تلاش میں۔ ۔ ۔"

"کیا تمہارے پاس بھی کھونے اور پانے کے لئے کچھ ہے"؟ پھر تینوں کھکھلا کر اتنے زور سے ہنس پڑیں کہ وہ ایک دم سے دنگ رہ گئی۔ اس کے ہونٹوں پہ ایک عجیب سی مسکراہٹ۔ بجھی بجھی سی خفت اور شرمندگی پھیل گئی — خلافِ توقع یہ جواب اُس کے لئے مہنگا پڑا۔ اس کے مزاج کی ساری بشاشت کافور ہو گئی۔ اُس کا پاؤں سڑک کے کنارے والے گندے پانی سے بھرے ہوئے ایک گڑھے میں پڑا۔ اور پانی اڑ کر اس کے جرابوں کو جہاں تہاں سے بھگو گیا — نان سنس، آوارہ!

ڈی سوزا رک گئی۔ وہ رک گئی۔ وہ مردوں کو ایسا کیوں کہتی ہے، یا کہنے پر مجبور ہے۔؟ جواب اسے نہیں ملا۔ اُلجھی اُلجھی سی کیفیت نے اس کے اعصاب کے گرد جال سا بن دیا تھا۔ کیوں کہتی ہے وہ ایسا۔؟ — کیوں کہتی ہے —؟ اس نے اپنے آپ سے بارہا سوال کیا مگر — اسے اطمینان نہ ہوا — وہ اس مسئلے پر پھر کبھی سوچے گی، پھر کبھی، کسی دن، اطمینان سے —

دفتر سے واپسی پر جس پان والے کی دکان سے وہ ٹپی کیلئے دو آنے کی ٹافی ہر روز بلاناغہ خریدتی ہے۔ وہاں ایک بڑا سا آئینہ لگا ہوا ہے۔ اکثر اس کے دل میں آیا کہ ایک پتھر اٹھا کر اسے چُور چُور کر دے۔ اس وقت بے خیالی میں آ کر اسی پان والے کی دکان کے سامنے کھڑی تھی۔ اندر لگے ہوئے شفاف آئینے میں ایک اجنبی چہرہ، بدصورت، چیچک سے بھرا چہرہ، بال خشک، روکھا اور آنکھیں گدلی گدلی۔

"یہ ٹافی میم صاحب" تمبولی نے دوسرے گاہکوں سے نمٹنے کے بعد چار ٹافیاں اس کی طرف اچھال دیں۔ اُس نے معاً ہاتھ اٹھا کر چاروں ٹافیاں روک لیں — ابھی ٹالی ہی

گر جاتیں تو۔! مگر یہ جملہ ادا کرنے سے پہلے ہی ڈی سوزا کو اس کا جواب مل گیا ۔۔۔ مگر گرتیں کیسے۔؟ ہر روز جس قدر مشینی انداز سے ٹانیاں اچھالتا ہے، اسی قدر مشینی ڈھنگ سے وہ روک لیتی ہے۔ اسے اطمینان سا ہوا۔ اچھا ہے۔ ہر کام ایک بندھے بندھائے انداز سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ کوئی نئی بات تو ہو۔ وہی گھر سے دفتر۔ دفتر سے جانی پہچانی سڑک سے گھر۔ ماں کے زخم کی ڈریسنگ، بچی کو پیار، پھر ریڈیو کی کی کنگ ۔ پھر گھر ۔ اور بستر ۔

صبح ہوئی، شام ہوئی

صبح ہوئی، شام ہوئی

زندگی تمام ہوئی ۔۔۔ زندگی ۔۔۔ زندگی ۔

"بے بی یہ زندگی بھی کیا ہوئی، ایک مانگی ہوئی روشنی ۔" اس کی ماں ہر روز اس وقت یہ جملہ دہراتی جب وہ اس کی ران کے گندے اور متعفن ناسور کو ڈریسنگ کر رہی ہوتی ہے۔ ایک موٹی بھدی بھینس کی طرح اس کی ماں ہر روز اپنی آبنوس کی سی پلپلی ران کھول کے اس کے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک گندے پیپ اور خون سے بھرے ہوئے تالاب میں اُبھرتی ڈوبتی محسوس کرتی ہے ۔۔۔ "شمع خود جلتی ہے، مگر دوسروں کے گھروں کی روشنی دینے کیلئے لہذا اس مانگے ہوئے نور کو ضائع نہ کرو۔" پھر کوئی کہانی جس کا لب لباب یہ ہے کہ ڈی سوزا اس کے اور اس کے ناکارہ شرابی بیٹے کی ضرورتیں پوری کرتی رہے، اور بس ۔ اور بس ۔۔۔ اس کے آگے کچھ نہیں۔

ابھی اس نے کمرے کے اندر قدم بھی نہیں رکھا تھا رابرٹ سامنے آگیا۔ "سسٹر پانچ ۔۔۔ صرف پانچ روپے چاہئیں ۔؟"

اس کی مسکین صورت سے ڈی سوزا کو بڑی نفرت ہے۔ اس کے باوجود اس مسکینی میں ضرور کوئی جادو ہے۔ جو اس کے دل کو نرم کر دیتا ہے۔ "مگر پی تو رکھی ہے تم نے ۔۔۔ اور کیا؟"

"مجھے نہیں پینا، بائی گارڈ ۔" اس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ وہ روزی ہے نا ۔۔۔ اُسے ۔۔۔"

ڈی سوزا دنگ رہ گئی۔ اتنا سا لڑکا۔ صرف سولہ برس کا رابرٹ روزی کے ساتھ عشق بھی کر سکتا ہے۔ اور پھر کس بے حیائی سے یہ سب کچھ وہ کہہ رہا ہے۔ گویا یہ کوئی بات ہی نہیں ۔۔۔ رابرٹ کی جرأت دیکھ کر وہ دھک سے ہو گئی۔ اس نے اس کی طرف دیکھا۔ سرج کی اونچی نیلی پتلون، اس پر عریاں لڑکیوں کی تصویروں سے بھری ہوئی بش شرٹ۔ گلے میں سرخ رنگ کا رومال، بکھرے بکھرے بھورے بال، چھوٹی چھوٹی گندی آنکھیں، خار میں ڈوبی ہوئی ۔۔۔ ڈی سوزا کو یہ لڑکا کچھ اجنبی سا لگا۔

"کیوں روزی کو شراب پلاتے گا۔ بتا تو؟ کیا لگتی ہے وہ تیری ۔۔۔ ؟؟" کانپتی ہوئی آواز میں ڈانٹنے لگی۔

یہ سن کر رابرٹ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "بائی گارڈ، تم خوب ہنستی ہو سسٹر۔" ہونٹ کو عجیب فحش انداز سے دانتوں سے دبا کر اس نے آنکھ ماری "تم سب جانتی ہو۔ سب کچھ۔"

ڈی سوزا گھبرا کر اندر چلی گئی۔ اگر اس کے بعد بھی وہ کھڑی رہتی تو جانے کیا کر بیٹھتا۔ اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ دل دھڑکنے لگا "سسٹر جا رہی ہو، لپک کر رابرٹ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور روپے پلیز۔" "نہیں نہیں ۔ میں ایک پیسہ بھی نہیں دوں گی ۔

ڈی سوزا نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دل رو اٹھا۔ سامنے ٹائلیٹ میز پر ایک سنہری فریم کے اندر یسوع مسیح افسردگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا ۔۔۔ میں کیا جانتی ہوں خداوند۔؟ یہ ذرا سا بچہ میرے ساکن تالاب میں کتنا بڑا پتھر پھینک گیا۔ میں دن بھر دفتر میں اور آدھی رات تک سینما میں محنت بیچتی ہوں۔ اپنی بیمار اور دکھی ماں کے گندے زخم کی ڈریسنگ کرتی ہوں۔ رابرٹ کو خوش رکھتی ہوں ۔۔۔ میں کیا جانتی ہوں گارڈ ۔۔۔ ؟ میں نے کب تمنا کی ہے کسی کی ۔۔۔ ؟ اکیلے سنگ دل بستر پر مجھے کچھ نہیں ملا ۔ کبھی کچھ نہیں ملا ۔۔۔ وہ زور زور سے رونے لگی۔ میز پر سر رکھ کر بہت دیر تک روتی رہی۔ کب اندھیرا ہوا۔ اسے پتہ نہیں چلا ۔۔۔ جب کسی ضرورت سے بیساکھی ٹیکتی ہوئی اس کی ماں کمرے میں آئی تو اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔

"ارے بے بی تم یہاں ہو! اس کی ماں نے تعجب سے کہا "میں تو ڈر رہی تھی، پتہ نہیں دفتر میں اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ تیری طبیعت خراب ہے بے بی؟" اس نے ڈی سوزا کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"نو ممی۔ ٹھیک ہوں۔ چلو جلدی تمہاری ڈریسنگ کر دوں۔ سینما کا فرسٹ شو تو گیا۔" اس نے آنسوؤں کو روک لیا۔

"نہیں، آج چھوڑ دو۔ تم نے چائے بھی نہیں پی ہے۔ چلو جلدی سے منہ ہاتھ دھو۔ ناشتہ کر لو ۔۔۔ پھر چلی جاؤ۔"

"نہیں، آج تین دن ہوگئے ــ ڈریسنگ کرنا ہی ہوگی۔ چلو میں ابھی کئے دیتی ہوں۔"

اس کی ماں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا "خدا تمہیں سلامت رکھے۔ تم نہ ہوتیں بے بی، تو پتہ نہیں کیا حالت ہوئی ہوتی اب تک ــ تو میرا بیٹا ہے ــ"

"تمہارا بیٹا" اس نے بڑی نفرت سے کہا "تمہارا بیٹا رابرٹ ہے نا ممی ــ ؟"

ڈی سوزا نے دیکھا، کمرہ تاریک ہو رہا ہے۔ اور ابھی تک روشنی نہیں جلائی گئی ہے اس نے اٹھ کر بلب روشن کیا۔ دونوں کھڑکیوں پر پڑے ہوئے پردے کو جھٹک کر الگ کر دیا۔ سامنے بنگالی بابو کے باغ سے پھولوں کی خوشبو نے اس کے چہرہ، نتھنے اور بالوں سے الجھتا ہوا، ہوا کا سیلاب سا کمرہ میں آگیا۔ دل نواز خوشبو نے ذرا دیر کیلئے ڈی سوزا کو ماحول سے بے خبر کر دیا۔

"کیا کیا رابرٹ نے ــ ؟" اس کی ماں پوچھ رہی تھی۔

"رابرٹ" ڈی سوزا رک گئی۔ ابھی ابھی رابرٹ کے نام پر نفرت کی ایک لہر سی اس کے دل میں اٹھی تھی، وہ لہر اس کے دل کے سمندر میں کہیں گم ہوگئی ــ اس نے جلدی سے کہا "کچھ نہیں ممی۔ رابرٹ بڑا شریر ہو گیا ہے ــ!"

"ہاں، ہاں ــ سوزا وہ بہت شریر ہو گیا ہے۔ ایک دن جانتی ہو کیا کہہ رہا تھا ــ ؟ کہہ رہا تھا مسٹر ڈارلنگ کی شادی کر دو" یہ کہہ کر ممی زور سے کھوکھلی ہنسی ہنسیں۔ ایک مری ہوئی ہنسی...

ڈی سوزا تڑپ اٹھی۔ اس ہنسی کو وہ خوب پہچانتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ کبھی کبھی اپنے کا عندیہ جاننا چاہتی ہے۔ خداوندــ خداوند یسوع ــ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ تیری دنیا کیسی مطلب پرست ہو گئی ہے۔ کتنی خود غرض۔ اور مکار بھی ضرور دنوں نے اس کی ماں ــ پیاری ماں کو کتنا کمینہ اور مکار بنا دیا ہے ــ مگر ذرا دیر میں ڈی سوزا کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں کے برے دنوں کی، دکھوں سے بھری بے شمار تصویریں پھر گئیں۔ کہیں سے ابل کر ذرا سا پیار آ گیا۔ اس نے اپنی ماں کے گلے میں بانہیں حائل کر دیں۔ اور اس کے سیاہ ــ مردہ چہرے کی طرح بدرونق گال کو چومتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

"میں سب جانتی ہوں ممی ــ سب کچھ، مگر میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔"

نہ جانے کہاں سے اس کی ماں کی ریگستان کی طرح خشک آنکھوں میں پانیوں کا سیلاب آگیا۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس نے سوزا کو بھینچ لیا ــ "ایک روز میں نے تمہارے پاپا سے کہا کہ "ڈارلنگ" وہ رک گئی۔ اس کی آواز گلے میں پھنسنے لگی۔ پھر ممی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ــ "کچھ نہیں ــ میرا مقدر شروع ہی سے خراب ہے سوزا۔ میں بڑی بدنصیب ہوں ــ" پھر وہ منہ ہی منہ میں بدبداتی آستین سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے بیساکھی کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

"میں تمہارے لئے چائے بناتی ہوں ــ گرم گرم چائے ــ" جاتے جاتے اس نے کہا۔

ڈی سوزا کو حیرت نہیں ہوئی ــ ذرا دیر کے لئے اس کی آنکھوں پر بھی آبی پردہ پڑ گیا تھا۔ جسے اس نے ہٹا دیا۔ دس سال میں کتنی بار وہ ممی کے دکھوں کے سمندر میں ڈوبی، ابھری ہے۔ گھونٹ گھونٹ دیکھ ڈالا ہے اس نے اب اس میں کوئی نیاپن نہیں، کوئی کشش نہیں۔

بارہ[۱۲] برس پہلے ایک روز اس کا باپ گھر سے کلکتہ کے لئے نکلا، اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ جب سے ممی کی زندگی دکھوں سے چُور ہے۔ اس نے کلکتہ کی گلی گلی ڈھونڈ ڈالی، شہر کا کونا کونا چھان مارا۔ مگر اس کا شوہر اسے نہیں ملا۔ ہر نیا دن اس کی زندگی کو بدرنگ کر کے گزر جاتا۔ اور ہر صبح اس کے چہرے کی رونق لٹتی گئی ــ لٹتی گئی۔

اس کی ماں نے سینکڑوں بار اپنے پاؤں کے ناسور کی ڈریسنگ کراتے ہوئے ڈی سوزا کو یقین دلانے کی کوشش کی ہے "مگر میں شروع سے ایسی بدرونق نقوڑی ہوں۔ میں تو بہت اچھی دکھتی تھی ــ میرے پپا ــ یعنی تمہارے گرانڈ فادر کہتے تھے ــ"

پھر وہ گرانڈ فادر کی زبانی دہرایا ہوا اپنے بچپن کا سینکڑوں بار سنایا ہوا وہ واقعہ بیان کرتی کہ کب ایک بار ہندوستانی جاگیرداروں، راجاؤں اور راؤ بچے درجے کے زمینداروں کی محفل میں وہ یعنی ڈی سوزا کا نانا اپنی بیوی کے ساتھ موجود تھے جہاں ان کے ساتھ ان کی تین سالہ بچی بھی تھی۔ جب ایک بڑے جاگیردار نے پیار سے اس کی اکلوتی بچی کو گود میں اٹھا کر بے حد پیار سے کہا تھا اور بے انتہا چاؤ سے پپا کو یقین دلایا تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں اتنی پیاری ــ اتنی خوبصورت بچی نہیں دیکھی ــ"

"جانتی ہو بے بی یہ بچی کون تھی؟"

"جانتی ہوں ممی، سب جانتی ہوں ــ" ڈی سوزا اکتاہٹ سے جواب دیتی "اور یہ بھی جانتی ہوں کہ میرے پپا جو بارہ برس قبل گھر سے بھاگ گئے ہیں، اس کی وجہ

کوئی اور بھی ——— ڈی سوزا نے ہنستے ہوئے بڑی شگفتگی سے کہا تھا۔ پھر یہ جملہ سن کر اس کی ماں چپ ہو گئی تھی اور ادھوری ڈریسنگ لئے اٹھ گئی تھی۔ شاید مذکرے میں جا کر روئی بھی ہو۔ مگر اس دن کے بعد اس کی ماں نے کبھی اپنے پپا کا وہ مشہور زمانہ قصہ نہیں دہرایا۔ جس کا ڈی سوزا کو بہت افسوس ہوا۔

"ممی کے دکھوں کا سمندر کتنا گہرا ہے اور کتنا وسیع ——— خداوندا ——— میری ماں نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ اس کے گناہ معاف کر ——— ڈی سوزا نے سینہ پر صلیب بنائی۔ شاید اس نے بھول چوک میں کوئی غلطی کی ہو ——— اسے معاف کر ——"

ممی کے دکھوں کے لئے خداوندا خدا سے معافی مانگتے مانگتے وہ یوں رونے لگی گویا ——— گویا وہ خود اپنی ممی ہو گئی ہے۔ بے حد سیاہ، بے حد موٹی، اور جسم کسی گوالے کی بھدی بھینس ——

"ممی میرے دل کی دھڑکنوں کو کیا ہوتا جاتا ہے بیٹھے بٹھائے ——— ؟" پتہ نہیں کس جذبہ کے تحت وہ ایک دن اپنی بوڑھی، کم ہمت ماں کو اپنی روح میں جھانکنے کی دعوت دے بیٹھی ——— یعنی میں جب ریو آئی بکنگ پر ہوتی ہوں، دفتر میں ہوتی ہوں تو تنہائی کے عالم میں میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ خاص کر جب رات کو سوتے سوتے اچانک کسی الجھے الجھے خواب ——"

پھر ڈی سوزا شرما گئی ——— وہ عجیب عجیب بے معنی خواب کے اظہار کیلئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں پا رہی تھی تر دلیدہ، کچھ سرخ، کچھ زرد رنگوں کے ایک دوسرے میں خلط ملط ہوتے ہوئے نامکمل، ٹوٹتے ہوئے سے خواب ——— کبھی کچھ خوبصورت، توانا جسم، دل کش آنکھیں، تراشیدہ لب، گھنی سیاہ بھنویں، ابھرتے ڈوبتے اجنبی چہرے، پھر ان بے شمار چہروں کے درمیان گوالے کی بھدی جسم والی سیاہ بھینس جگالی کرتی ہوئی ——— وہیں کہیں یسوع مسیح کا تابناک چہرہ ——— مسکراہٹ ——— تقدس ——— افسردگی ——

اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی ——— "پھر ممی ڈارلنگ، اس وقت میرا دل بہت زوروں سے دوڑنے لگتا ہے۔ اور میرے بستر کی چادر پسینے سے تر بتر ہو جاتی ہے ——"

اس کی ماں کچھ نہیں کہتی صرف سر نہوڑائے سنتی رہتی۔ اور آہستہ آہستہ گردن کو یوں جنبش دیتی رہتی گویا وہ ڈی سوزا کی ایک ایک بات کو بڑے غور سے سن رہی ہے۔ پھر آہستہ سے مدبرانہ اور مربیانہ انداز میں کہتی ——— "ہاں ہوتا ہے ——— ہوتا ہے ——— ایسا ہوتا ہے ——"

"کیا ہوتا ہے ممی ——؟"

جواب میں ممی ہنس پڑتی ——— "کیا ہوتا ہے ——— کیا ہوتا ہے ——— مجھے تو اس کا پتہ ہی نہیں ——" پھر اس کی ممی پرانے اسٹول کی ابھری ہوئی کیل کو سینڈل کی ایڑی سے ٹھونک کر اس پر بیٹھ جاتی ——— مگر میں اتنا جانتی ہوں کہ خداوند یسوع تجھے بہت چاہتا ہے۔ اور تو اس کے صلیب کے نیچے بیٹھی ہوئی ایک حور ہے۔ جس کے تقدس ———"

خداوند یسوع میں تمہاری صلیب کے نیچے بیٹھی ہوئی ایک حور ہوں۔ جو تمہارے مقدس لہو کی بوند بوند کو اپنی روح کے پیالے میں اتار رہی ہوں اور تم چاہو تو صدیوں یوں ہی اپنے فرض کو خوش اسلوبی سے سرانجام دیتی رہوں گی مگر یہ مجھے کیا ہوتا ہے خداوند کہ بیٹھے بٹھائے میرا دل بے قرار ہو اٹھتا ہے۔ اور میرے دل کے ویرانے میں دور دور تک دھول اڑنے لگتی ہے۔ گرم اور سیاہ دھول۔ کیا مجھے اس سے نجات نہیں ملے گی؟ کیا یہ سیاہ بگولہ کسی دن مجھے اپنے ساتھ لے اڑے گا ؟؟

بتاؤ، مجھے کوئی بتاؤ ——— میں اس وقت کیا کروں گی ؟ کہاں جاؤں گی ——— ؟؟ ڈی سوزا دل ہی دل میں رو پڑی۔

"تم مجھے کہیں چھوڑ کر چلی نہ جاؤ ——— بے بی ——— ڈرتی ہوں ——— میں بہت ڈرتی ——— جس وقت تم میرے زخم کو صاف کر رہی ہوتی ہو اور گندے پیپ اور خون سے چھپاتے ہوئے زخم کو، تو میں تکلیف سے بے خبر یہ سوچنے لگتی ہوں کہ تم کہیں چلی نہ جاؤ ——— لیکن پھر یہ سوچ کر دل خوش ہو جاتا ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گی۔ کیونکہ بے بی سچائی اسے کہتے ہیں جو ہے۔ اور جو نہیں ہے وہ سب، جھوٹ ہے۔ مثلاً اس دنیا میں میرے سوا تمہارا باپ بھی تھا۔ تھا تو تھا۔ پر اب موجود نہیں۔ مثلاً یہ کہ کل تمہارا ایک رفیق حیات بھی ہوگا۔ ہو گا بھی نہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارے ڈیڈی کی طرح وہ بھی تمہیں ٹھکرا کر چلا جائے۔ اس لئے شکوک کی دنیا میں رہنے سے بہتر ہے کہ انسان یہ سمجھنے لگے کہ کل جو تھا وہ بھی جھوٹ تھا اور کل جو ہوگا ——— وہ بھی جھوٹ ہے ——"

بے بی جو خیالوں کے آسمان پر اڑ رہی تھی۔ اکتا گئی ——— "ہاں ممی، اور آج گزر کر کل میں بدل جائے گا تو وہ بھی محض جھوٹ ہو سکتا ہے کیوں ؟" جس کا جواب ممی کے پاس نہیں۔ اس لئے اس نے کچھ نہیں کہا صرف سوچ کر رہ گئی۔

جب وہ ممی کے زخم کی ڈریسنگ کر چکی اور کپڑوں کی سفید پٹیوں کو اچھی طرح سے کس کر سیفٹی پن سے اسے ٹانک دیا تو اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ اب تک ایک گہرے

سمندر میں غوطہ لگائے ہوئے تھی۔ اور اب جو وہ بہت دیر بعد پانی کے باہر نکلی ہے تو اس کا تنفس ذرا تیز ہو گیا ہے۔ مگر کھلی ہوا نے، بنگالی بابو کے باغ سے جھوم جھوم کر خوشبوؤں کا بوجھ لئے ہوئے مست کن ہوا نے اس کے اعصاب کو بیدار کر دیا۔ اس کے جسم کو فضا میں اچھال دیا ۔۔۔ اُسے وہ شام یاد آئی۔ جب کارسلک ہاؤس کے کاؤنٹر پر ایک رومال خریدتے وقت۔ ایک مدراسی نوجوان نے بڑی محبت سے اس کی طرف دیکھا تھا ۔۔۔ عجیب نوجوان تھا۔ اُسی شام کو اُس کی ملاقات ہوئی۔ چند گھنٹے ریوالی میں گذارنے کے بعد خواہش ظاہر کر بیٹھا۔ ڈی سوزا اسے بہت پسند ہے۔ وہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے ۔۔۔ وہ اس کو کہیں لے جانا چاہتا ہے ۔۔۔ عجیب سرپھرا ۔۔۔ جذباتی ۔۔۔ اُس دن وہ اس مدراسی لڑکے کو ڈانٹ کر گھر چلی آئی تھی ۔۔۔ گھر آنے کے بعد اپنی ماں کے زخم دھوتے وقت اس کو بڑی خوشی ہوئی تھی کہ اس نے بہت درست کیا جو اسے ڈانٹ دیا ۔۔۔ اس گھر میں، اس کو کیا پتہ کہ اس کی کتنی ضرورت ہے وہ پھر کبھی اس کو اکیلے میں نہیں ملی۔ وہ راستہ سے آتے جاتے سلک ہاؤس کے کاؤنٹر پہ بیٹھا ہوا اسے تاکا کرتا۔ مگر ڈی سوزا چپ چاپ یوں گردن جھکائے گذر جاتی۔ جیسے چلتے چلتے اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہی نہیں ہوئی ہوں۔

کچھ بے اختیاری کے عالم میں اُس کے پاؤں آپ ہی آپ کمرے سے باہر کی سمت اُٹھ گئے۔

باہر کی دنیا بیحد خوبصورت ہو رہی تھی۔ حد درجہ جوان۔ ابھی چند گھنٹے پہلے سیاہ گھٹاؤں کا سمندر امنڈ رہا تھا۔ جس کے باعث ساری فضا وقت سے پہلے تاریک ہونے لگی تھی۔ ایسی تاریک کہ اسے دفتر کی تین تین بڑی کھڑکیوں والے کمرے میں روشنی جلانی پڑی تھی۔ مگر ذرا بعد یہ گھٹا اچھی طرح برسے بغیر ہی نامعلوم سفر کو چل پڑی تھی۔ ایسے ہی ۔۔۔ ایسے ہی ۔۔۔ ڈی سوزا کے چھوٹے سے، خوشگوار سماں کے سبب قدرے لاپرواہ دماغ کو کوئی استعارہ نہیں سوجھا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ایک عجیب خجالت آمیز ہنسی۔ کچھ پُر کیف جھینپ سی۔ جیسے اُس کے دل میں ارمانوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگ جاتا ہے۔ ذرا دیر کے لئے ۔۔۔ مگر وہ سوچتے سوچتے افسردہ ہو گئی۔ ذرا ہی دیر کے لئے تو، پھر تو اس کے دل کا وسیع آسمان کیسا سونا پڑ جاتا ہے۔ یہ امڈتے بادل برسے بغیر پتہ نہیں کدھر چلے جاتے ہیں ۔۔۔

مگر آج تو ذرا بارش بھی ہوئی ہے اور آنکھ بچا کر بھاگے ہوئے مسافر چپکے سے اپنا قرضہ چکا بھی چکے ہیں کہ کسی کو خبر ہے تو کسی کو نہیں ۔۔۔ ڈی سوزا خوش ہو گئی۔

سامنے آسمان پر اس کونے سے اُس کونے تک سات رنگوں والی دھنک، اس کی خوشیوں کا رنگین جھولا ابھر آیا تھا ۔۔۔ تعجب ۔۔۔ حیرت!

اس نے گردن اٹھا آسمان کی طرف دیکھا ۔۔۔ "تم کہاں رہتی ہو ۔۔۔ کہاں چھپی رہتی ہو ۔۔۔؟"

پتہ نہیں کون بول رہا تھا۔ کس کی آواز تھی۔ ڈی سوزا کو یوں لگا گویا وہ ایک نہیں ہے۔ اس کے دو وجود ہیں۔ ایک کھردرا سخت اور کسی قدر بے ڈھنگا۔ تو دوسرا بڑا نرم، بہت نازک، بے حد ملائم، ریشم کی طرح، عجیب عادت ہے۔ اس کی۔ کچھ پوچھے بغیر تو رہتا ہی نہیں۔ مچل پڑتا ہے "کہاں چھپی رہتی ہو میری خوش رنگ دھنک ۔۔۔؟"

ڈی سوزا نے سوچا، جیسے وہ بڑا آسمان ہے۔ جس پر ہر دم لوگوں کی غرضوں اور ضرورتوں کی کالی کالی بھدی بھینسیں یہاں سے وہاں تیرتی رہتی ہیں۔ کچھ اس طرح کہ اس کا وجود ہی ڈھک جاتا ہے۔ یک دم سے چھپ جاتا ہے ۔۔۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ بادل چھٹ جاتے ہیں، اور ۔۔۔ اس نے پھر آسمان کی طرف دیکھا ۔۔۔ دل نواز رنگوں والی دُھنک کہیں سے نہایت آہستہ روی سے چپکے سے اُبھر آتی ہے۔ پیارے پیارے رنگ ۔۔۔ نیلے نیلے ۔۔۔ سرخ ۔۔۔ سبز ۔۔۔

اس کے سامنے رنگ برنگے کپڑوں کے تھان کے تھان بکھرے پڑے تھے۔ ذرا ہوش کی دنیا میں لوٹی تو ڈی سوزا اپنے آپ کو سلک ہاؤس میں پاکر متعجب ہوئی سامنے کاؤنٹر میز پر رنگ برنگ کے کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ ڈھیروں خوش رنگ کپڑے۔ ایک گورے رنگ کی بنگالی لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ ہلکے آسمانی رنگ کی ساری میں ملبوس، بیحد حسین معلوم ہو رہی تھی۔ دُلہن سی۔ اس کی مانگ میں یہاں سے وہاں تک سیندور یوں جھلملا رہا تھا۔ جیسے زندگی کے سارے ارمان پورے ہو رہے ہوں۔ ساری کا آنچل سر پہ جما ہوا تھا۔ جس کے ایک کونے کو اس نے دانتوں سے دبا رکھا تھا۔ بار بار وہ نظریں اُٹھا کر اپنے شوہر سے کچھ کہتی۔ ہر بار اپنے شوہر کی شریر نگاہوں اور معنی خیز مسکراہٹوں سے شرما کر نظریں جُھکا لیتی۔ اُس وقت اُس کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور آنکھیں یوں مست ہو جاتیں گویا اب نشہ بکھیرنے لگیں گی۔ ڈی سوزا کو یہ جوڑا اتنا اچھا لگا۔ خصوصاً یہ لڑکی جو دُلہن تھی شاید، اتنی پیاری لگی کہ وہ اسکی ذات میں محو ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا گویا وہ خود دلہن بنی اپنے شوہر کے ساتھ سلک ہاؤس میں مُسکرا مُسکرا کر اور شرما شرما کر کپڑے خرید رہی ہے۔ اس کا سارا وجود موم کی طرح سُبک ہو گیا۔ اور اس کے رگ و پے میں ہلکی ہلکی سنسناہٹیں پھیلنے لگیں۔

"آپ کو کیا چاہیئے میڈیم؟" اس مدراسی نوجوان نے قدرے بے توجہی سے کہا۔ اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"مجھے ایک رومال چاہیے۔"

"میم صاحب کو رومال دکھاؤ۔" اس نے پاس والے لڑکے سے یوں رکھائی سے کہا، گویا اتنے بڑے سلک ہاؤس میں چودہ آنے کا رومال خریدنے والا گاہک انتہائی بے بضاعت ہوتا ہے۔

ڈی سوزا کو تضحیک محسوس ہوئی۔ اس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر اس خوبصورت بنگالی لڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ اسے پان والے کے شیشے میں دکھائی دینے والا بدصورت، چیچک بھرا، اجنبی چہرہ یاد آیا۔۔۔ دفعتاً اسے اپنی بے بضاعتی کا بڑا شدید احساس ہوا۔۔۔ وہ جھلائی۔۔۔ اُلجھی۔۔۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پھر وہ رومال لئے بغیر پاؤں ٹپکتی شوروم سے باہر نکل گئی۔

باہر کی دنیا حسب حال ویسے ہی تھی۔ صاف ستھری، دُھلی دُھلائی سی، خوبصورت سی، مگر۔۔۔ مگر کیا چند منٹ کی معمولی بارش، اس برسوں کی بدصورت دنیا کے چہرے کی میل دھو سکتی ہے؟ اسے یوں لگا، جیسے یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ سلک ہاؤس، یہ خوبصورت بنگالی لڑکی جو دلہن بنی بات بات پر اندر ہی اندر سے مُسکرا پڑتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ بظاہر خوبصورت اور صاف ستھری نظر آنے والی دنیا، سب ایک حسین جھوٹ تلے چھُپی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی موٹی بھدی انتہائی مکروہ ٹانگ لجلجا رہی ہے۔ جس پر ڈی سوزا جیسی بدنصیب لڑکی جُھکی، بوند بوند کر کے اپنے ارمانوں کے لہو ٹپکا رہی ہے۔

اسے اپنے اس استعارہ کو سوچ کر قدرے اطمینان سا ہوا۔ ایک جھلاہٹ جو اس کے اعصاب پر بدرنگ کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ وہیں کہیں دب گئی۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تو اس کی زلفوں کو چھیڑ کر گزر گیا۔ پھر دوسرا شوخ جھونکا اس کے رخساروں کو چومنے لگا۔۔۔ مگر اسے یوں محسوس ہوا۔ گویا اسے گھر پہنچنا ضروری ہے اور صبح و شام کا ازلی اور ابدی چکر اسے پکار رہا ہے۔

"بے بی زندگی مانگے کی روشنی ہے۔ اسے یوں ضائع مت کرو۔۔۔"

ڈی سوزا گھر لوٹ رہی تھی تو اس نے دیکھا۔ بکیس کینٹین کے باہر کھڑی روزی بار بار رابرٹ کے کمرے کی سمت دیکھ رہی ہے۔ نفرت سے اس کا جی بھر آیا کہ آگے بڑھ کر روزی کو ایک بھرپور طمانچہ لگائے۔ بدذات۔ ذلیل لڑکی، کیا اتنی بڑی دنیا میں تجھے اور کوئی کام نہیں؟

مگر ڈی سوزا رک گئی کیا خود اسے اتنی بڑی دنیا میں کاموں کی کمی نظر آتی ہے؟ اس کے قدم من من بھر کے ہوگئے تھے۔ پھر وہ مڑ گئی۔ برسات کی اودی اودی رات بڑی تاریک تھی بکیس کینٹین کی مدہم روشنی بڑی مدہم تھی۔ بیماری، کسی انسانی دل کی طرح مدقوق۔۔۔ پھر اس کی نگاہ رابرٹ کی کھڑکی کی طرف گئی۔ وہاں بھی روشنی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر رابرٹ کو ڈھونڈنے لگیں، اس نے جھانک کر اس کے کمرے میں دیکھا۔ رابرٹ اپنی رنگین بشرٹ اور اونچی پتلون سمیت چارپائی پر اوندھا پڑا تھا۔

"رابرٹ۔۔۔"

"رابرٹ سو گئے کیا؟"

رابرٹ اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ "یس، سسٹر۔۔۔ نہیں نہیں سویا۔۔۔" پھر اس کے چہرے کی مسکینی رو پڑی۔

ڈی سوزا نے اس کی طرف دیکھا اور یکایک اس نے محسوس کیا۔ گویا اس کا دل اچھل کر حلق تک پہنچ گیا ہے اس نے پرس سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا، رابرٹ کی طرف پھینک کر تیزی سے اپنے کمرے میں گھس گئی اور دروازہ بند کر لیا۔

"وقت کتنا وسیع آسمان ہے۔۔۔" ڈی سوزا نے ماں کی گود کی طرح عافیت دینے والی چارپائی پر لیٹتے ہوئے سوچا۔ وقت کتنا وسیع آسمان ہے۔ جس پر ارمانوں کا پیاسا پرندہ پانیوں سے تھل تھل بھرے ہوئے سیاہ بادل کے گرد محوِ پرواز ہے۔ بے معنی، فضول، لاحاصل۔

سامنے ڈائیلیٹ میز پر خداوند یسوع حسبِ دستور مسکرا رہا تھا۔ ڈی سوزا کا دل رو پڑا۔۔۔ خداوند، تو گواہ ہے۔۔۔ تو گواہ ہے۔۔۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ میں بھی تو ایک بدصورت سیاہ صلیب برسوں سے جھول رہی ہوں، بے گناہ، بے خطا!"

~~~
~~~

شاہد احمد دہلوی
افکار (کراچی)

جوش ملیح آبادی

دیدہ و شنیدہ

میرے والد مرحوم کو اُردو کی نئی مطبوعات منگانے کا شوق تھا۔ کتابیں اور رسالے چھپتے ہی ان کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ غالباً ۲۵ء یا ۲۶ء کا ذکر ہے کہ نئی کتابوں میں ایک کتاب "روحِ ادب" بھی آئی تھی۔ یہ کتاب اُس زمانے میں شائع ہونے والی کتابوں سے یکسر مختلف تھی۔ اس کی ہر بات انوکھی تھی۔ "بانگ درا" کے سائز پر چھپی تھی، جو اس زمانے میں بالکل مُروّج نہیں تھا۔ کتابت و طباعت بڑی دیدہ زیب تھی۔ چند تصویریں بھی اس کتاب میں شامل تھیں۔ "روحِ ادب" میں چھوٹے چھوٹے شاعرانہ مضامین تھے۔ شاعرانہ مختصر مضامین لکھنے کا خبط اب سے چالیس سال پہلے ہر ادیب کو تھا۔ بلکہ اسے کمالِ نثر نگاری سمجھا جاتا تھا کہ ایسی عبارت لکھی جائے جس میں موٹے موٹے عربی فارسی کے الفاظ اور مُغلق ترکیبیں ہوں اور اصل بات بہت ذرا سی ہو۔ بلکہ اگر اصل بات سرے سے اس میں ہو ہی نہیں تو اور بھی اچھا۔ اس صورت میں یہ تحریر ادیب کا شاہکار بن جاتی تھی۔ ایسے ہر ادیب کی ہر تحریر شاہکار تصوّر کی جاتی تھی۔ کتنے ہی ادیب ایسے تھے۔ جو صرف شاہکار ہی لکھا کرتے تھے۔ اصل میں یہ بیماری گیتا نجلی کے ترجمہ سے اُردو میں پھیلی تھی۔ ٹیگور کی مابعد الطبعیاتی شاعری کو یار لوگ سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں جھٹ اس کے ترجمہ پر اُتر آئے۔ چونکہ ٹیگور کو نوبل پرائز ملا تھا اس لئے یہ سمجھ لیا گیا کہ ضرور اس میں کوئی بڑے کام کی بات کہی گئی ہے۔ حالانکہ آج تک یورپ والوں ہی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ملارمی اور ماترلنک قسم کے شاعر یہ کیا فرما گئے ہیں کہ ؎

ایک دروازہ کھُلا
ایک دروازہ بند ہوا اور
ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔

انہیں یہی معلوم نہ ہو سکا کہ اس پر کہاں سر دُھنا جائے؟ ٹیگور نے بھی یہی گُر استعمال کیا اور ییٹس نے اسے جھنڈے پر چڑھا دیا۔ اُردو کی شامتِ اعمال، یہ کتاب کہیں سے نیاز فتحپوری کے ہاتھ لگ گئی۔ "عرضِ نغمہ"، کے نام سے اِس کا ترجمہ فوراً تیار ہو گیا۔ نام ہی دیکھ لیجے، "عرض نغمہ"۔ اس کے اندر جو گت ٹیگور کے شاہکار کی بنی ہے اُسے کسی وقت فرصت سے دیکھیے گا تو اس کے جوہر آپ پر کھُل جائینگے۔ ہمارے ادیبوں کے ہاتھ ایک سہل نسخہ لکھنے لکھانے کا آیا، لگے سب کے سب عرضِ نغمہ کرنے۔ البتہ اتنا اضافہ ٹیگور پر اندر کیا کہ اپنی تحریروں میں بہت سارے آہ —— ڈیش اور نقطے اور ڈنڈے (!) جہاں تہاں ڈال دیئے تاکہ پڑھنے والے اِن ڈیشوں اور ڈنڈوں سے نفسِ مضمون کی بھیلی پر سر پھُٹول کرتے رہیں۔ پیاز کو چھیلیے، پرت ہی پرت اُترتے چلے جائیں گے، مغز آپ کبھی نہیں پائیں گے۔ یہی حال اس نیازی یا پیازی ادب کا تھا جسے "ادب لطیف" موسوم کیا گیا، جو دراصل ہماری نثر کا "چوما چاٹی اور سانڈے کے تیل" کا دور تھا۔

بات میں سے بات نکل آئی ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا بات پہنچی تری جوانی تک

ہاں تو ذکر تھا "روحِ ادب" کا۔ اس میں جو نثر پارے درج تھے ان کا اندازِ تحریر روش عام سے یکسر مختلف تھا۔ واقعی یہ معلوم ہوتا تھا کہ نثر میں نظمیں لکھی گئی ہیں۔ مصنف کا نام تھا نواب شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی۔ میں نے جوش صاحب کو یہیں سے جانا پہچانا۔ اس کے بعد "ہمایوں" میں اِن کا کلام بالالتزام شائع ہونے لگا اور بعض مقتدر ادبی رسالوں میں بھی۔ ساقی میں جنوری ۱۹۳۰ء، یعنی پہلے ہی پرچے سے جوش صاحب کا کلام آنے لگا۔ ۳۲ء میں مجھے اپنے منجھلے بھائی مبشر احمد اور دوسرے عزیزوں سے ملنے حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے جن ادیبوں اور شاعروں سے حیدر آباد میں ملنا تھا ان کی فہرست خاصی طویل تھی۔ منجھو صاحب پولیس کے آدمی! اُنہیں تمام سلسلوں کی خبر تھی۔ فہرست دیکھ کر بولے "فرحت اللہ بیگ سے تمہیں سید وزیر حسن ملوائیں گے۔ فانی، جوش اور علی اختر سے کرنل اشرف اسحٰق۔ مولوی عنایت اللہ سے تابش، میں بھی ساتھ چلا چلوں گا۔ تمکین کاظمی تو یہ سامنے ادارۂ علمیہ میں روز شام کو آتا ہے۔ اور یہ ناکارہ اور آوارہ اور کون کون ہے، انہیں تھانے میں یہیں کیوں نہ جھجوا لیا جائے؟" میں نے کہا "مناسب نہیں ہوگا۔ پہلے ایک ایک بار میں سب کے ہاں ہو آؤں۔" بولے "تو پھر یہ کرتے ہیں کہ تھانے میں نہیں کھانے پر سب کو بلائے لیتے ہیں۔" میں نے کہا "اسے بھی لیب کے لئے اٹھا رکھو۔" یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کرنل اشرف اسحٰق باہر ہی سے آوازیں دیتے در آئے۔ "شاہد کہاں ہے، شاہد کہاں ہے؟" میں دوڑ کر ان سے لپٹ گیا۔ اُس وقت مجھ سے عمر میں دُگنے تھے۔ میرے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ چودہ سال ولایت میں رہ کر اڈنبرا سے ڈاکٹری کی سند لے کر آئے تھے اور قلعہ گولکنڈا میں افواجِ باقاعدہ کے بڑے ڈاکٹر تھے۔ اللہ ان کی روح کو نہ شرمائے ہر وقت پیتے تھے اور اتنی پیتے تھے کہ مرنے لگتے تھے۔ وہ تو شراب کیا چھوڑتے شراب انہیں چھوڑ دیتی تھی۔ اچھے ہونے کے بعد مہینوں نہیں پیتے تھے، پھر کوئی دوست اُنہیں مٹکا دیتا اور سلسلہ پھر جاری ہو جاتا۔ مگر اتنی پینے پر بھی میں نے ڈاکٹر صاحب کو کبھی بہکتے یا مدہوش ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ اس قدر عجیب و غریب کردار کے آدمی تھے کہ ان پر ایک علیحدہ مضمون لکھنے کی ضرورت ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ منجملہ اور صفات کے شعر کہنے کا بھی خاص ملکہ رکھتے تھے۔ مگر ہزل تو کیا نرا اکھڑا فحش۔ عریاں تخلص تھا۔ شعر شاعری کی وجہ سے حیدر آباد کے تمام شاعروں سے تعلق تھا اور سب کا دم بھی ان سے نکلتا تھا کیونکہ ذرا سی بات پر فحش ہجو لکھ دیا کرتے تھے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ خود جا کر اسے سُنا بھی دیتے تھے۔ خیر تو ڈاکٹر صاحب سے یہ طے ہو گیا کہ جوش صاحب سے مجھے وہ اگلے دن ملوا دیں گے۔ دوسرے دن صبح دس بجے ڈاکٹر صاحب آئے اور مجھے دار الترجمہ لے گئے۔ سب سے پہلے ابوالخیر مودودی سے ملوایا جو ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی ہیں۔ دھان پان سے نرم و نازک آدمی تھے مگر اُن کے لفظ لفظ سے علمیت ٹپکتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ خوش اخلاقی سے کھانے پر مدعو کیا۔ مولانا عمادی سے ملوایا۔ انہوں نے بھی دعوت کی پیش کش کی۔ جوش صاحب سے ملوایا۔ گرم جوشی سے ملے۔ دعوت کا دن مُقرّر کر لیا۔ باہر نکل کر میں نے کہا "بھائی جان، اگر دعوتیں ایسی فراخ دلی سے منظور کی گئیں تو منجھو صاحب بگڑ جائیں گے۔" بولے "میں منجھو کو سمجھا لوں گا۔" اس کے بعد گھڑی دیکھ کر بولے "ابھی دوپہر کے کھانے میں کچھ دیر ہے، لگے ہاتھوں علی اختر سے بھی مل لو۔" میں نے کہا "چلیے۔" علی اختر صاحب کے گھر پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ لڑکا برآمد ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "ابّا ہیں؟" وہ "ہیں" کہہ کر اندر بھاگا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "سُنو۔ اُن سے بولو شاہد احمد دہلوی ملنے آئے ہیں۔" لڑکا میرا نام جانتا تھا، ایک نظر اس نے مجھے دیکھا اور تیتری ہو گیا۔ پانچ منٹ گذر گئے واپس نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ آج کل علی اختر کے سارے جسم پر پھوڑے" پھنسیاں نکل آئی ہیں۔ دوا ملے بیٹھا ہوگا۔ دفتر سے چھٹی لے رکھی ہے۔ بارے لڑکا مُنہ لٹکائے واپس آیا اور نیچی نظریں کئے بولا "ابّا کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔" جب ہم کار میں واپس آ بیٹھے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا "گھر ہی میں تھا۔" میں نے پوچھا "تو ملے کیوں نہیں؟" بولے "کل معلوم ہو جائے گا۔" اگلے دن ڈاکٹر صاحب علی اختر کے ہاں سے ہوتے ہوئے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ "علی اختر ملے تھے اور بہت شرمندہ تھے کہ کل تم سے نہیں ملے۔ دراصل اس بیچارے کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ تمہاری دعوت کر سکے یہاں کا رواج یہی ہے کہ مہمان کی دعوت ضرور کی جاتی ہے۔" ان کی اس حرکت پر مجھے غصّہ بھی آیا اور ترس بھی آیا کہ محض ایک بیہودہ رواج کے باعث اس دفعہ ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

جوش صاحب کے ہاں ڈاکٹر صاحب مجھے لے گئے۔ خاصی پُر تکلف دعوت تھی۔ دستر خوان پر ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ روتوں کو ہنساتے تھے۔ جوش صاحب شاعر بھی تھے اور بادہ خوار بھی، اس لئے ڈاکٹر صاحب سے ان کی خوب بنتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی زبانی مجھے جوش صاحب کے بہت سارے واقعات معلوم ہوئے۔ ان میں سے چند آگے بیان ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب عمدہ ولایتی شراب پیا کرتے تھے۔ جوش صاحب بلانوش تھے۔ جو بھی مل جائے چڑھا جاتے تھے۔ انہیں جب بھی فرصت ملتی شام کو ڈاکٹر صاحب کے ہاں جا پہنچتے۔ عمدہ اور مُفت کی ملتی تھی اس لئے گلاس پر گلاس چڑھائے چلے جاتے۔ ڈاکٹر صاحب دو تین گلاسوں میں جھک جاتے تھے۔ بوتل یا تو ہفتہ میں ایک خرچ ہوتی تھی یا اب تیسرے ہی دن ان کی بیوی کہہ دیتیں کہ آپ شہر جائیں تو اپنی بوتل لیتے آئیں۔ شروع شروع میں تو یہ ڈھرّا چلتا رہا مگر جب مہنگا پڑنے لگا تو ڈاکٹر صاحب کے نشے ہرن ہونے لگے۔ ایک دن شہر گئے تو ایک ولایتی بوتل بھی لائے اور دیسی ٹھرّے کی بھی۔ ٹھرّا دیکھ کر اُن کی بیوی چمکیں "جب ٹھرّا آپ کو نہیں پچتا تو آپ کیوں لائے ہیں؟ اس مُوئے شرابی نے آپ کو بھی ٹھرّے پر لگا دیا۔" ڈاکٹر صاحب نے بڑی متانت سے کہا "یہ ٹھرّا اُسی موئے شرابی کے لئے ہے۔" ڈاکٹر صاحب گلاس خود کبھی نہیں بناتے تھے۔ گھر میں بیوی بنا کر دیتی تھیں اور گھر کے باہر ایک ملازم جو ہمیشہ ساتھ رہا کرتا تھا۔ اب یہ ہونے لگا کہ جوش صاحب آجاتے تو ڈاکٹر صاحب کے آواز لگانے پر مُلازم دو گلاس بیگم صاحب سے بنوا کر یا خود بنا کر لاتا اور ٹھرّے والا گلاس جوش صاحب کو پکڑا دیتا۔ جوش صاحب کہتے کہ آپ نے بھی دیسی پینی شروع کر دی؟ تو ڈاکٹر صاحب کہتے ہاں۔ مگر یہ دیسی اچھی ہے۔ فریب کا یہ سلسلہ دنوں جاری رہا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ ان کے دل میں کوئی بات رہتی نہیں تھی۔ شاید ہر شرابی کا دل مُنافقت سے خالی ہو جایا کرتا ہے۔

جب جوش صاحب کے لئے نظام دکن میر عثمان علی خاں نے مُلک بدری کا فرمان جاری کیا تو مجھے کسی نے حیدر آباد سے اطلاع دی کہ ساقی میں "غزل گو سے خطاب" جو نظم جوش کی چھپی ہے اُس پر عتاب ہوا ہے۔ بیٹھی کے ایک مُنہ چڑھے آدمی نے نظام کو سُنا دیا کہ حضور یہ گستاخی جوش نے آپ کی شان میں کی ہے اُس زمانے میں جریدۂ شاہی اور روزنامہ رہبر دکن میں روزانہ میر عثمان علی خاں کی ایک پھُسپھسی سی غزل مع رائے اُستاد جلیل چھپا کرتی تھی۔ یہ رائے بھی حضرت خود ہی لکھ دیا کرتے تھے کہ "سبحان اللہ! کیا غزل ہوئی ہے۔" مجھے اطلاع دینے والے نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ شاید ریاست میں ساقی کا داخلہ بھی ممنوع قرار دیدیا جائے گا۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ جوش کو چوبیس گھنٹے میں ممالکِ محروسہ سے نکل جانے کا حُکم ملا تھا۔ یہ بارہ ہی گھنٹے میں وہاں سے نکل گئے کہ کہیں ضبطی اور قید کا دوسرا فرمان جاری نہ ہو جائے۔ "رہبر دکن" میں روزانہ ذرا ذرا سی بات پر فرمان نکلتے رہتے تھے۔ سبحان اللہ! پڑھنے کے لائق ہوتی تھی عبارت ان فرمانوں کی۔ کاش کوئی انہیں جمع کر کے شائع کر دے۔ خوجی اور حاجی بغلول کو آپ بھول جائینگے۔ خیر، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ دراصل نظام کے منجھلے شہزادے مُعظّم جاہ کے شبینہ دربار میں جوش کا عمل دخل ضرورت سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اس دربار کے واقعات سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ سرکار کا دربار حرام پور اس کے آگے گرد تھا۔ جوش اس دربار کے حاضر باش تھے۔ میں نے حیدر آباد کے ثقہ راویوں سے سُنا ہے کہ معظم جاہ کے اشارے پر کُل حاضر باش ننگے ہو کر ناچنے لگتے تھے، اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا تھا وہ لکھا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی نیا پنچھی ذرا انہیں نکھرے کرتا تو پیش خدمتوں کو حکم ہوتا کہ آپ کو بنا لاؤ۔ وہ اُس غریب کو اُٹھالے جاتے اور پچھاڑ کر اتنی پلاتے کہ اُسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔ پھر اُسے دربار میں برہنہ کر کے پیش کیا جاتا اور اُسے اوندھا کر کے جلتی ہوئی موم بتّی لگا دی جاتی۔ یہ منظر دیکھ کر سب کے دلوں کے کنول کھِل جاتے اور جب وہ ہوش میں آتا تو اُس سے کہا جاتا "آئندہ کبھی سرکار کے کسی حکم سے سرتابی نہ کرنا۔" اِن تمام بیہودگیوں کی اطلاع عالیجاہ کو پہنچتی رہتی تھی مگر وہ شفقتِ پدری میں مرے جاتے تھے۔ بیٹے سے تو کچھ نہ کہتے اس کے حاضر باشوں کی تاک میں لگ جاتے۔ چنانچہ طویلے کی بلا بندر کے سر، لہذا جوش پر نزلہ گرانے کا انہیں بہانہ ہاتھ آگیا۔ جوش صاحب حیدر آباد چھوٹنے کے کچھ عرصہ بعد دلی آگئے۔

حیدر آباد میں جوش صاحب دار الترجمہ میں ناظر ادبی تھے۔ سُنا ہے علامہ اقبال سے کسی بڑے آدمی کے نام تعارفی اور سفارشی خط لے کر حیدر آباد گئے تھے۔ نرا کھرا شاعر سوائے شعر کہنے کے اور کیا کر سکتا ہے؟ مگر اس وقت مہاراجہ کشن پرشاد جیسے علم دوست برسرِ اقتدار تھے۔ وہ شاعروں کو بھی کہیں نہ کہیں کھپایا کرتے تھے۔ چنانچہ فانی کو انہوں نے کسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا تھا اور یگانہ کو کہیں اضلاع میں سب رجسٹرار رکھوا دیا تھا۔ جوش کو انہوں نے دار الترجمہ کی پول میں دھانس دیا۔ ان کا کام یہ تھا کہ تراجم کی نظر ثانی کیا کریں۔ وہاں وہ کیا کرتے ہوں گے؟ اس کا اندازہ یہاں ترقی اُردو بورڈ میں اُن کی کارکردگی سے ہوا۔ بورڈ نے اُردو کی نایاب اور کم یاب کتابوں کے شائع کرنے کا بھی

انتظام کیا ہے۔ مولوی نذیر احمد کی کتاب "منتخب الحکایات" کے متعلق بورڈ کے سیکریٹری شان الحق صاحب کا ایک مراسلہ میرے نام آیا کہ آپ اس مطبوعہ کتاب میں جو غلطیاں کتابت و طباعت کی وجہ سے داخل ہو گئی ہیں ان کی تصحیح کر دیجئے اور کتاب پر آٹھ دس صفحے کا مقدمہ لکھ دیجئے۔ پاکستان میں یہ کتاب مجھے کہیں نہیں ملی، لہٰذا دلّی سے اس کا ایک نسخہ کسی نہ کسی طرح منگایا اور اسے ٹھیک ٹھاک کر کے بورڈ کو بھیج دیا۔ ایک مہینہ بعد حقّی صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ منتخب الحکایات کا کوئی اور نسخہ ہو تو بورڈ کو بھیج دیجئے۔ بورڈ اس کی قیمت ادا کر دے گا۔ میں نے کہا "قیمت تو اس کی چھ آنے یا آٹھ آنے ہی ہے مگر وہ کتاب ملتی کہاں ہے؟ پہلے بھی مشکل سے ملی تھی" معلوم ہوا کہ ناظر ادبی نے نہ صرف میرے مقدمہ کی زبان ٹھیک کر دی بلکہ اصل کتاب کی زبان بھی ٹھیک کر دی۔ اور فقرے کے فقرے اس بری طرح کاٹے ہیں کہ اصل عبارت پڑھی نہیں جا سکتی میں نے کہا "خیر میری زبان تو وہ ٹھیک کر سکتے ہیں مگر جس کی کتابیں پڑھ کر ہم سب نے اردو زبان سیکھی ہے اس کی زبان میں بھی جوش صاحب کو غلطیاں نظر آ گئیں۔ ذرا مجھے اصلاح شدہ نسخہ بھیج دیجئے تاکہ میں بھی جوش صاحب کے افادات سے محروم نہ رہوں۔" حقّی صاحب بُردبار آدمی ہیں، انہوں نے یہ لطائف الحیل اس قضیہ کو ٹالا اور میں نے دلّی سے ایک اور نسخہ مہیا کر کے انہیں بھیجا۔ دارالترجمہ کے ناظم مولوی عنایت اللہ مرحوم بڑے مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ جوش صاحب سے خوش نہیں تھے۔ جب کام کرنے کا یہ اسلوب ہو تو کوئی خوش ہو بھی کیسے سکتا ہے؟

دلّی آنے کے بعد جوش صاحب نے ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ جو ادبی ماہنامے شائع ہو رہے ہیں اُن کی مالی حالت کیسی ہے اور انہیں کیسے چلایا جا رہا ہے۔ یار لوگوں نے ورغلایا اور جوش صاحب چڑھ گئے سُولی پر۔ دریا گنج میں ایک مکان کرایہ پر لیا گیا اور بڑیوں کے کٹڑے میں دفتر کے لئے ایک بالاخانہ کرو فر سے سجایا گیا۔ ایک دفعہ مجھے بھی اس دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جوش صاحب کو واہ واہ کرنے والے گھیرے رہتے۔ دن بھر چائے، شربت، پان سگریٹ سے تواضع ہوتی۔ اِدھر سورج غروب ہوا اُدھر جوش صاحب پیمانہ بکف طلوع ہوئے۔ مفت خوروں کو بھی چسکی لگانے کا موقع ملا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ یہ شغل رہا۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھر سدھارے۔ ادبی رسالے بھلا کہیں ایسی شاہ خرچیوں سے چلتے ہیں؟ چند مہینے بعد دفتر چھوڑنا پڑا۔ گھر ہی پر دفتر بھی چلا گیا۔ پرچہ چلنے کی کوئی صورت نہیں نکلی۔ جوش صاحب کو یہ مغالطہ تھا کہ جتنی اچھی وہ نظم لکھتے ہیں اتنی ہی اچھی نثر بھی لکھتے ہیں۔ ایک نیا مضمون نگار اسرائیل احمد خاں انہوں نے خدا جانے کہاں سے تلاش کر کے نکالا تھا۔ وہ اینڈے بینڈے مضامین لکھا کرتا تھا یہ زمانہ تھا ہمایوں، ادبی دُنیا، نیرنگ خیال، عالمگیر اور ساقی کے شباب کا۔ جوش صاحب نے محسوس کر لیا کہ پبلک بڑی ناقدر شناس ہے، وہ نسل کبھی مستقبل بعید میں پیدا ہو گی جو اُن کے رسالے کی صحیح قدر دانی کر سکے گی۔ رسالہ بند کرنے کے بعد انہوں نے ایک مقامی پبلشر سے اپنی کتابیں چھپوانے کا معاملہ کیا۔ چندے ان کی رائلٹی پر گذارا ہوا۔ پھر یہ سُنا کہ ملیح آباد کی طرف اِن کا کوئی بہت بڑا زمیندار عزیز مر رہا ہے یا مر گیا ہے اور اس کی پوری املاک کے وارث جوش صاحب ہی ہیں۔ اب اُنہیں کئی کروڑ روپیہ ملنے والا ہے اس لئے وہ دلّی سے چلے گئے ہیں۔ یہ سُننے میں آج تک نہیں آیا کہ انہیں وہاں سے کیا ملا۔

جوش صاحب کے دوران قیام دہلی میں ایک دفعہ کرنل اشرف الحق دلّی آئے تو مجھ سے کہا کہ جوش کے ہاں چلو۔ میں نے کہا "مجھے تو ان کا گھر معلوم نہیں کہاں ہے۔ کہیں دریا گنج میں رہتے ہیں۔ پھر آپ ہی نے تو کہا تھا کہ جوش سے دُور کی دوستی رکھنا۔ ویسے بھی میں شعر و شاعری کا آدمی نہیں، اور نہ جوش کا ہم مشرب۔ آج تک میں اُن کے گھر نہیں گیا اور نہ وہ میرے گھر آئے۔ سر راہے کہ ہے یا کسی اجتماع میں اُن سے سرسری سی مُلاقات ہو جایا کرتی ہے۔ آپ اُن کے ہاں ہو آیئے میں ساتھ جا کر کیا کروں گا؟" ڈاکٹر صاحب نے اُس زمانے میں شراب بالکل چھوڑ رکھی تھی۔ بولے "تمہارا چلنا ضروری ہے۔ اگر وہاں پینے پلانے کا قصہ ہوا تو تم مجھے روک سکو گے۔" لہٰذا مجھے ان کے ساتھ جانا پڑا۔

مغرب کے بعد ہم جوش صاحب کے مکان پر پہنچے۔ نیچے ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں جوش صاحب کے ساتھ پانچ سات آدمی بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھا تو سینے اُٹھ کر تعظیم دی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "شاہد کو جانتے ہونا"؟ جوش صاحب نے کہا "جی ہاں۔ مگر کبھی ملاقات نہیں ہوتی۔" بیٹھنے کے بعد اوروں سے تعارف ہوا۔ حکیم آزاد انصاری کو میں پہلے سے جانتا تھا۔ اب وہ جوش صاحب کے ہاں مستقلاً آن ٹِکے تھے۔ بڑھاپے اور بیماری میں اُن کا کوئی پُرسان حال نہیں رہا تھا۔ کبھی کسی کے ہاں اور کبھی کسی کے ہاں جا پڑتے۔ میزبان اُن کے مُنہ کی وجہ سے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ اس کے بعد اُن سے شعر کہلوا کہلوا کر اپنی بیاض

بھرتا۔ جب وہ اپنے شعر دینے میں پس و پیش کرتے تو میزبان بُرا ماننے لگتا۔ حکیم صاحب اس بے غرضی اور ناقدری کو تاڑ جاتے اور کسی اور قدردان کے ہاں اُٹھ جاتے۔ ایک صاحب کا تو پورا دیوان آزاد انصاری ہی کا کہا ہوا ہے۔ دلّی میں انہوں نے کئی ٹھکانے بدلے۔ آخر میں ایک مُفلس مگر مخلص شاگرد کے ہاں چلے آئے تھے، اور جب ان کی حالت بگڑی اور ڈاکٹروں نے جواب دیدیا تو وہ غریب شاگرد حیدرآباد انہیں لے کر پہنچا، اور اُن کے بیٹے کے گھر انہیں چھوڑ آیا۔ بیٹا اچھا خاصہ پیسے والا تھا۔ مگر بہ استکراہ اُس نے باپ کو وصول کیا۔ بڈھے میں دھرا ہی کیا تھا۔ دو چار دن بعد اللہ کو پیارا ہو گیا۔ تو یہ آزاد انصاری بھی جوش صاحب کے ہاں موجود تھے۔ نہال سیوہاروی بھی پہنچے ہوئے تھے۔ دورِ شراب چل ہی رہا تھا، ایک گلاس ڈاکٹر صاحب کے لئے اور ایک میرے لئے تیار کر کے پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "شاہد تو نہیں پیتے، اور میں نے بھی آج کل چھوڑ رکھی ہے۔" جوش صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بے ساختہ اُن کے منہ سے نکلا ؎

ساقی کے مُرید اور نہیں ہیں مخمور
بر عکس نہند نام زنگی کافور!

کیا واقعی بالکل نہیں"؟ میں نے کہا "جی ہاں، میں نہیں پیتا۔" جوش صاحب نے ازراہِ عنایت مزید اصرار نہیں کیا مگر ڈاکٹر صاحب سے بولے۔ "جی یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کو تو پینی پڑے گی۔" یہ کہہ کر اُن کے ہاتھ میں لبریز گلاس تھما دیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو ٹہوکا دیا مگر انہوں نے متاسف نظروں سے میری طرف دیکھا اور چُپکے سے بولے "جوش نہیں مانتا۔ تھوڑی سی پی لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔" جوش صاحب کو سُرور گنٹھ رہا تھا، اُن کی گُل افشانی شروع ہو گئی بلا کا حافظہ پایا ہے اس شخص نے۔ نشہ بڑھتا جاتا تھا اور زبان کھُلتی جاتی تھی۔ ملحدانہ رُباعیوں کے بعد اپنا فحش کلام سُنانا شروع کر دیا۔ جب وہ بھی ختم ہو گیا تو فی البدیہہ کہنا شروع کر دیا۔ مگر آخر میں یہ اعتراف بھی کیا کہ اس کا اُستاد تو رفیع احمد خاں ہے۔ دو گھنٹے بعد میں نے اجازت چاہی تو ڈاکٹر صاحب بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ بولے "شاہد، تم مجھے گھر پہنچا کر جانا۔" باہر نکل کر میں نے تراہا بیرم خاں کا تانگہ کیا۔ پھاٹک سے ٹیڑھی حویلی تک انہیں سہارا دے کر لے گیا۔ نیچے کرایہ دار تھے، اُوپر کی منزل میں ڈاکٹر صاحب کا قیام تھا۔ زینہ طے کرنا ایک عذاب ہو گیا۔ جب اُنہیں اُن کے کمرے میں پہنچایا تو اُن کی چھوٹی بیگم جو اُن کے ساتھ آئی تھیں بولیں "شاہد میاں، یہ کیا کیا؟" ڈاکٹر صاحب پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھتے رہے۔ میں نے کہا "بھابی، یہ جوش صاحب کے ہاں سے آرہے ہیں۔" چیخ کر بولیں "اُس ماٹی ملے کے پاس انہیں کون لے گیا تھا؟" میں نے کہا "خود ہی گئے تھے۔"

"شاہد میاں، تم نے بھی انہیں نہیں روکا؟"

"روکا تھا، بھلا یہ رُکنے والے ہیں؟"

ڈاکٹر صاحب بڑبڑائے "عباسی، شاہد کو جانے دو۔ اسے دیر ہو رہی ہے۔"

اس کے بعد خدا جانے میاں بیوی میں کیا فضیحتا ہوا۔ اگلے دن ڈاکٹر صاحب میرے ہاں آئے تو اُن کے بیگ میں ولائتی بوتل موجود تھی اور وہ ہر آدھ گھنٹے بعد گلاس بنواتے اور پیتے رہے۔ اُن کی شراب پھر شروع ہو گئی تھی اور اب خود اُن کے روکے بھی نہیں رُک سکتی تھی۔ پھر دو دن تک ڈاکٹر صاحب نہیں آئے تو مجھے مزاج پُرسی کے لئے اُن کے گھر جانا پڑا۔ پہلے بھابی اور بچوں کا کمرہ بیچ میں پڑتا تھا۔ بھابی کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ بولیں "نہ کچھ کھا سکتے ہیں اور نہ پی سکتے ہیں۔ ابکائی لگی ہوئی ہے۔" ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں جا کر دیکھا کہ وہ بے سُدھ پلنگ پر پڑے ہوئے ہیں اور ڈاکٹر محمد عُمران کے سرہانے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے جاتے ہی ڈاکٹر عمر نے میری ٹانگ لی "اماں کیوں لے گئے تھے انہیں اُس کے پاس؟" میں نے کہا "اب کیفیت کیا ہے؟" بولے "مر رہے ہیں۔" میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ لو بھئی، اُلٹی آنتیں گلے پڑیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب کو کھانسی اُٹھی اور وہ اُوکتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے، چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی۔ سینے میں سانس نہ سماتا تھا۔ مگر خوش مزاجی کی وہی کیفیت۔ ہانپ کر بولے "بھائی —— یہ عمر کہتا ہے کہ میں مر رہا ہوں، مگر میں مروں گا نہیں —— عباسی ایک گلاس بنا دینا۔" ڈاکٹر عمر نے کہا "مرنے سے بدتر ہو گئے مگر چھوڑتے اب بھی نہیں۔" بولے "تیری طرح کم ظرف تھوڑی ہوں۔ پینے کا نام بھی بدنام کرتا ہے۔" اتنے میں عباسی بیگم گلاس بنا لائیں۔ ڈاکٹر صاحب کے منہ سے لگا دیا۔ پی کر بولے "بھائی —— اب میری دوا بھی یہی ہے۔" غرض ڈاکٹر صاحب ایک ہفتہ تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ بیہوشی میں ڈاکٹر عمر اُن کے انجکشن لگاتے رہے۔ ہوش میں آنے کے بعد انہوں نے شراب نہیں پی۔ مہینہ بھر میں ساؤنڈ ہو گئے اور خیر سے حیدرآباد سدھارے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پطرس بخاری نے مجھے رقعہ بھیجا اور زبانی بھی کہلوا بھیجا کہ سالک صاحب آئے ہوئے ہیں، کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ میں وقت مقررہ سے کسی قدر پہلے پہنچ گیا تاکہ سالک صاحب سے باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔ ہم دو چار آدمی سالک صاحب سے گپ شپ کر رہے تھے کہ جوش صاحب بھی آن پہنچے۔ علیک سلیک کے بعد کوٹھی کے برآمدے میں گئے۔ وہاں جنگل کشور مہرا بیٹھے ہوئے تھے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور پطرس بخاری کے پرسنل اسسٹنٹ تھے۔ جوش صاحب نے ان سے پوچھا "پینے پلانے کے لئے کیا ہے؟" انہوں نے گھبرا کر کہا "بخاری صاحب تو نہیں پیتے"۔ جوش صاحب نے کہا "وہ نہیں پیتے تو کیا، ہم تو پیتے ہیں۔ جاؤ بخاری صاحب سے کہو کہ ہمارے لئے کچھ پینے کو بھیجیں"۔ وہ دوڑے ہوئے آئے اور بخاری سے کچھ کھسر پھسر کر کے پھر جوش صاحب کے پاس پہنچے۔ خبر نہیں پھر ان دونوں کے درمیان کیا گزری۔ مہمان آنے شروع ہو گئے۔ آنے والوں میں بڑے متضاد قسم کے لوگ تھے۔ خواجہ حسن نظام بھی تھے اور دیوان سنگھ مفتوں بھی۔ تقریباً بیس پچیس جغادری قسم کے حضرات کھانے پر جمع ہو گئے۔ جوش صاحب الگ گھاس پر ٹہلتے رہے تھے۔ مجھے ان کے قریب جگہ ملی۔ پوچھنے لگے "ابے کس نے بلالیا؟" میں نے کہا "کسے؟" خواجہ صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ بولے "جب سے یہ آیا ہے واللہ کفن وکافور کی بو چلی آرہی ہے"۔ ان کے اس فقرے کا مزہ اوروں نے بھی لیا اور بات شدہ شدہ بخاری صاحب تک بھی پہنچ گئی۔ وہ کھکھلا کر ہنسے۔ اس کے بعد جوش صاحب نے بھری میز پر بخاری صاحب کو مخاطب کر کے کہا "دو شعر ہو گئے ہیں، سن لیجئے"۔ مجھے تو شعر دیر یاد نہیں رہتے۔ مطلب یہ تھا کہ نام تو بخاری ہے مگر جنڈی اتنی سی ہے کہ پینے کو شراب مانگو تو ـــــ ملتا ہے ٹھنڈا، برف کا سادہ پانی۔ سب نے واہ واہ سبحان اللہ میں ان اشعار کو اڑا دیا۔ خود بخاری صاحب نے کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ خوب داد دی۔

فتحپوری کے قریب ایک ہوٹل میں فراق گورکھپوری دلّی آکر ٹھہرے تھے۔ شام کو ان کے کمرے میں بہت سارے پینے والے شاعر جمع ہوئے۔ ان میں جوش، ہلال، مجاز اور تاثیر بھی تھے۔ جوش صاحب تو شاعرِ انقلاب ہونے کے علاوہ شاعرِ اعظم بھی ہیں مگر اپنے پندار میں فراق سے اپنے آپ کو کم نہیں کچھ زیادہ ہی سمجھتے ہیں۔ جوش نے جب رباعیاں کہنی شروع کیں تو فراق نے بھی اردو ہندی آمیز زبان میں روپ سروپ کی رباعیوں کی بھرمار شروع کر دی۔ جوش صاحب نے کبھی کسی سے مقابلہ نہیں کیا۔ خبر نہیں یہ ان کی بزدلی ہے یا شرافت۔ مگر فراق صاحب ہمیشہ میدان میں اتر آتے ہیں اور شمشیر براں بن جاتے ہیں۔ ویسے تو جوش اور فراق میں بڑا دوستانہ تھا اور دونوں ہم نوالہ ہم پیالہ تھے مگر فراق جوش کو اپنا حریف سمجھتے تھے۔ جب ہوٹل کے کمرے میں کئی دور ہو گئے تو پینے والوں کے دل کھل گئے اور دلوں کے ساتھ زبانیں بھی کھل گئیں۔ جوش اور فراق میں چلنی شروع ہوئی، پہلے مذاق ہی مذاق میں پھر نشتہ زدہ سنجیدگی کے ساتھ۔ حاضرین میں سے کچھ جوش کے ساتھ ہو گئے اور کچھ فراق کے ساتھ۔ فراق کچھ حد سے آگے ہی نکل گئے۔ نوبت تیز تم تازی اور گالی گلوج تک پہنچی۔ اس میں ذرا کمی آتی تو تاثیر کبھی جوش کو شہ دیتا اور کبھی فراق کو۔ فراق ایسے بے قابو ہوئے کہ ماں بہن کی گالیوں پر اتر آئے۔ جوش نے ان گالیوں کو بھی کڑوا گھونٹ بنا کر حلق سے نیچے اتار لیا۔ مگر جب فراق نے بیٹی کی گالی دی تو جوش کے تیور بگڑ گئے۔ بولے "ہم پٹھان ہیں، اب ہم آپ کو قتل کر دیں گے"۔ یہ کہہ کر اٹھنے لگے تو سب نے بڑھ کر انہیں پکڑ لیا اور معاملہ رفع دفع کیا۔ اس سارے قضیے میں تاثیر کے چہرے پر جو خباثت کی خوشی تھی وہ دیکھنے کی چیز تھی۔

جوش صاحب اور علی اختر مرحوم کا کسی بات پر اختلاف ہوا۔ دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ کوئی بہت بڑی بیہودہ بات ہوئی ہوگی جوش صاحب کی طرف سے جو علی اختر جیسے سادھو قسم کے آدمی کو ناگوار گزری۔ اس زمانے میں نیاز فتحپوری بھی حیدرآباد پہنچے ہوئے تھے۔ ان کے مراسم دونوں شاعروں سے تھے۔ علی اختر تو بیچارے خاموش ہو گئے۔ مگر نیاز صاحب نے محسوس کیا کہ انہیں جوش سے بدلہ لینا چاہئے چنانچہ لکھنؤ واپس پہنچ کر نیاز صاحب نے "نگار" میں کلام جوش پر تنقید لکھنے کا سلسلہ جاری کر دیا۔ جوش نے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا کہ یکسر خاموشی اختیار کی۔ نیاز صاحب بک جھک کر خود ہی خاموش ہو رہے۔ جس نوعیت کی تنقید نیاز صاحب لکھتے ہیں اس سے خود اپنی علمی فوقیت جتانا مقصود ہوتا ہے۔ مگر پڑھنے والا بھانپ جاتا ہے کہ اس میں جھوٹ بچ تو بہت ہوتی ہے خلوص مطلق نہیں ہوتا۔ "اس مصرعہ میں ہ دب رہی ہے، یہ مصرعہ چست نہیں ہے۔ پہلے مصرعے کا دوسرے مصرعے سے ربط نہیں ہے۔ اس میں تنافر ہے۔ اگر یہ مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا" اس کے بعد وہ اپنی اصلاح پیش کر دیتے ہیں اور شعر کا اگلا روپ بھی کھو دیتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے "نگار" کا "جگر نمبر" شائع کیا ہے۔ ان کا انداز تنقید ملاحظہ فرما لیا جائے۔

کرنل اشرف الحق بڑے جہاں دیدہ اور گرم وسرد چشیدہ آدمی تھے۔ اوپر سے بالکل ٹھنڈے اور اندر لاوا کھولتا رہتا تھا۔ دو چار ہی باتوں میں تاڑ جاتے تھے کہ کون کتنے پانی میں ہے، ورنہ آزمانے کے لئے کوئی اشغل چھوڑ دیتے تھے۔ دکن میں کا ماتیں رکھنے کا عام رواج تھا۔ یہ نیچ قوم کی جوان عورتیں ہوتی ہیں۔ جو عموماً

اُوپر کے کام کے لئے رکھی جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک سنگ اسود کی ترشی ہوئی جوان کا ماٹن یلاّ ڈاکٹر اشرف کے ہاں مُلازم تھی۔ راوی نے بیان کیا کہ ایک شام کو آواز دینے پر یلاّ دو گلاس اندر سے بنا کر لائی۔ جوش صاحب اِس کالی پری کو دیکھ کر دیکھتے ہی رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "دیکھتے کیا ہو، اوپر ہے جاؤ"۔ بس اتنا کہنا کافی تھا، آگے بڑھ کر یلاّ کو گھیر لیا۔ ساتھ دیتے رہے۔ اور کل اُس پر میں۔ لگے ایک طرف لے جاکر التفات کرنے۔ اُس نے جھڑک دیا۔ ناکام واپس آئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا "سُنو جوش، بیوی میری بھی جوان ہے۔ تمہارا کیا اعتبار، کل کو تم اُس پر بھی ہاتھ ڈال دوگے۔ لہذا آج سے یہ سلسلہ بند۔" جوش پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور شرمندگی میں انہوں نے واقعی گولکنڈہ آنا جانا چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر صاحب ہی جوش کے پاس پہنچ جایا کرتے تھے۔

دلّی میں ایک جیّد عالم ہیں مولانا عبد السلام۔ قلندر مزاج اور یونانِ قدیم کے رواقی فلسفیوں جیسے آدمی ہیں۔ عربی۔ فارسی، اور اُردو کے مُنتہی ہیں جس علم سے کہو خدا کے وجود کو ثابت کر دیتے ہیں۔ ان کا سکوت پہاڑوں کا سکوت اور گفتگو دریاؤں کی روانی ہے۔ اب تو اسّی سے اُونچے ہوں گے۔ جوش صاحب جب دلّی آئے تو اُن کی تعریف سُن کر اُن سے ملنے گئے۔ مولانا نے جب جوش صاحب کے خیالات سُنے تو اُن کا ناریل چٹخا۔ بولے "تمہارا دماغ تو شیطان کی کھڈّی ہے۔" اِس سے مختصر اور جامع تجزیہ جوش صاحب کا نہیں ہو سکتا۔

جوش صاحب کٹّر کانگرسی تھے۔ مسلمانوں سے اِنہیں کیا ملتا؟ مسلمان ان کے ملحدانہ اور گستاخانہ خیالات کی وجہ سے اِنہیں بُرا سمجھتے تھے۔ لہذا یہ ہندوؤں سے جا ملے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور مسز سروجنی نائیڈو جیسے ادب دوستوں نے ان کی سرپرستی قبول کر لی تھی۔ ایسے رکا بیہ مذہب والوں کا کوئی کردار تو ہوتا ہی نہیں۔ جہاں دیکھا توا پرات، وہیں گزاری ساری رات۔ کردار تھا یگانہ کا کہ بھوکوں مرا، ذلت و خواری اُٹھائی اور مرتے مر گیا مگر اپنی بات پر اَڑا رہا۔ جوش نے ہمیشہ اپنے ترنولے کی خیر منائی۔ جو شخص خدا کا مذاق اُڑا سکتا ہے اور شیطان و ابو جہل کی عظمت کی قسم کھا سکتا ہے اس کے لئے پاکستان اور قائدِ اعظم کو بُرا بھلا کہنا بھلا کیا مُشکل ہے۔ جو شخص ازراہِ تمسخر نہیں بلکہ نہایت سنجیدگی سے ایسی باتیں کرتا ہو تو اُس کے لئے مُسلمان کیا اور پاکستان کیا؟ ڈٹ کر پاکستان کی مخالفت کی اور قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان ہی میں رہ گئے۔ ہندو پرستی کا یہ عالم رہا کہ گاندھی جی کے ہلاک ہونے پر جوش صاحب نے اپنی نظم "شہیدِ اعظم" لکھی۔ ہرچند کہ جوش صاحب کے گُزشتہ اعمال اس لائق تھے کہ انہیں پاکستان بدر کر دیا جاتا تاہم پاکستان کی حکومت اور پاکستان کے عوام نے وسیع القلبی سے کام لے کر انہیں امان دی اور ترقیِ اُردو بورڈ میں سولہ سو روپے ماہانہ پر لُغت نویسی کے کام پر انہیں لگا دیا۔ جوش اور لُغت نویسی! مارول گھٹنا پھوٹے آنکھ! یہی وہ زمانہ تھا کہ موصوف نے ایک طویل نظم "چیا جور گرم" لکھی جس میں پاکستان کی بھبتی اُڑائی اور جسے وہ بڑے طمطراق سے اپنے مخصوص حلقوں میں سُناتے پھرتے تھے۔ بے دینی اور پاکستان دُشمنی کے باوجود، اور حکومتِ ہند کی سرپرستی کے باوصف جوش صاحب ہندوستان میں نہیں رہ سکے اور پاکستان آ گئے۔ خبر نہیں اُن کی غیرت نے اسے کیسے قبول کر لیا۔ بے دینی کا داغ چھپانے کے لئے انہوں نے مرثیے کہنے شروع کئے اور پاکستان دوستی کے اظہار کے لئے صدر ایوب کی شان میں ایک ناصحانہ قصیدہ کہا۔ جُوتیوں سمیت آنکھوں میں گھُسنا اسی کو کہتے ہیں۔ نو سو چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی!۔

پاکستان بن جانے کے بعد جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے تھے اُن کی وفاداری کو ہمیشہ شُبہ کی نظر سے حکومتِ ہند نے دیکھا۔ یہاں تک کہ ابو الکلام آزاد کے بعض بیانات پر پٹیل نے انہیں بھی مطعون کیا۔ مگر جوش صاحب کی وفاداری کسی کو مُشتبہ نظر نہ آئی۔ پنڈت نہرو مُروّت کے آدمی ہیں، اُنہوں نے اِن کے حلوے مانڈے کا انتظام کر دیا تقریباً دو ہزار روپے ماہانہ کی انہیں یافت کرا دی گئی۔ کام کچھ نہیں، صرف نگرانی اور مشورہ۔ حکومتِ ہند نے انہیں "پدم بھوشن" کے اعلیٰ خطاب سے بھی نواز دیا۔ دس سال تک جوش صاحب ہندوستان میں خوب موج مارتے رہے۔ لیکن ہندو ایک مسلمان کو اچھے حالات میں دیکھنا بھلا کیسے پسند کر سکتے تھے۔ تاک میں لگے رہتے اور اِن کی ذرا ذرا سی بات کی گرفت کرتے۔ جوش صاحب ایک غیر محتاط آدمی، قدم قدم پر ان سے لغزش ہوتی۔ خفیف الحرکتی اور بعض غلط باتیں بھی کرتے۔ یار لوگ بڑھا چڑھا کر اُوپر کے حلقوں میں پہنچاتے اور وزیرِ اعظم کے کان بھرتے۔ پنڈت جی طرح دے جاتے۔ مگر چشم پوشی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ سُنا ہے کہ جوش صاحب کی ساکھ اتنی بگڑ گئی کہ ہندوستان میں اُن کا مزید قیام خطرے میں پڑ گیا۔ جب دلّی کی فضا اِن کے لئے ضرورت سے زیادہ گرم ہو گئی تو انہوں نے پاکستان کا رُخ کیا۔ یہاں آکر کراچی کے چیف کمشنر نقوی سے ملے اور اُن کے ذریعہ سکندر مرزا سے۔ لو صاحب! یہاں کوئی چار ہزار روپے ماہانہ کا اِن کے لئے انتظام ہو گیا۔ یہاں کا معاملہ پکّا کر کے موصوف پھر دلّی پہنچے اور سُنا ہے کہ پاکستان کی

پیش کش دکھا کر پنڈت جی سے پھر معاملت کرنی چاہی۔ مگر وہاں سے جواب مل گیا کہ آپ کا پاکستان چلا جانا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ اُردو ہندی اور اپنے بچّوں کے مستقبل پر ایک بیان دیکر جوش صاحب کراچی چلے آئے۔ ادھر اخبار والوں کو سُن گن مل گئی کہ نقوی صاحب نے جوش پروری کے لئے کیا کیا اسباب مہیا کئے ہیں۔ اُردو اخباروں میں لے دے شروع ہوگئی اور جوش صاحب " از آن سُو راندہ و ازیں سُو درماندہ " کی زندہ مثال بن کر رہ گئے۔ چار ہزار روپے ماہوار کا سُہانا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ اپنے موجودہ حالات سے جوش صاحب سخت نا مطمئن و ناخوش ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مجھ پر پندرہ بیس افراد و خاندان کا بار ہے۔ اپنی اولاد کے علاوہ اولاد کی اولاد کے بھی جوش صاحب ہی کفیل ہیں۔ بیاہی تیاہی بیٹی اور داماد بھی ان ہی کے سر ہیں۔ سُنا ہے کہ داماد صاحب بی۔ اے؛ بی ٹی ہیں۔ اسکول کی ملازمت کو بہت گھٹیا چیز تصوّر کرتے ہیں۔ حضرتِ جوش کا داماد اور اسکول ماسٹری! دُنیا کیا کہے گی؟ لہٰذا مع بیوی اور جوان جوان بچّوں کے جوش کے گھر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور شاعرِ انقلاب کی عزت و آبرو کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جوش صاحب ستّر کے پیٹے میں ہیں۔ اتنی عمر اور اتنی دُنیا دیکھنے کے بعد بھی ان کے مزاج کا بھولپن نہیں گیا۔

بھولپن پر اُن کے مزاج کا ایک اور پہلو یاد آ گیا۔ اپنی شاعری کی بدولت جوش صاحب ہمیشہ سے حُکّام رس رہے ہیں۔ اہلِ غرض انہیں گھیرے رہتے ہیں۔ سعی سفارش کرنے میں جوش صاحب ذرا بھی ہچر مچر نہیں کرتے۔ سفارش بیشتر نالائقوں ہی کی کی جاتی ہے۔ جوش صاحب نے کسی بڑے آدمی سے کسی کی سفارش کی اور اس کی تعریف کے پُل بھی باندھ دیئے۔ بڑے آدمی نے کہا " مگر جوش صاحب، یہ صاحب تو اس جگہ کے لئے موزوں نہیں ہیں "

" جی اور کیا۔ بالکل ناموزوں ہیں "

" تو اس صورت میں یہ جگہ تو انہیں نہیں دی جا سکتی "

" جی بے شک۔ کیسے دی جا سکتی ہے "

چلئے چُھٹّی ہوئی۔ اُمیدوار سے کہہ دیا کہ " صاحب، آپ تو اس جگہ کے لئے قطعی ناموزوں ہیں "

اُس نے واویلا مچایا کہ " حضرت مجھ سے زیادہ موزوں تو کوئی اور ہے ہی نہیں "

" یقیناً آپ سے زیادہ موزوں کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے "

" صاحب یہ بڑا متعصب افسر ہے "

" جی ہاں۔ میرا بھی یہی اندازہ ہے۔ سخت مُتعصّب ہے کم بخت "

غالباً جوش صاحب سب کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے ان کی گفتگو ہمیشہ اثباتی ہوتی ہے۔ اسے آپ چاہیں تو اُن کا بھولپن کہہ لیں چاہے یہ کہہ لیں کہ جوش صاحب بے پیندی کے بدھنے ہیں۔

اسی سے ملتا جُلتا واقعہ گلڈ کے قیام کے وقت پیش آیا۔ جمیل جالبی صاحب سے جوش صاحب کا خاصہ ربط ضبط ہے۔ طے پایا کہ جمیل صاحب جا کر جوش صاحب کو گلڈ کے پہلے اجلاس میں شرکت کی دعوت دیں۔ جمیل صاحب نے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ ڈرگ روڈ میں ان کی کوٹھی پر پہنچ کر پھاٹک پیٹا تو ایک ادھیڑ عمر کے صاحب تشریف لائے اور بولے " آہا۔ میں اطلاع کرتا ہوں "۔ جمیل صاحب نے بتایا کہ یہی وہ جوش صاحب کے معروف داماد ہیں جو کچھ نہیں کرتے۔ تھوڑی دیر میں لوٹ کے آئے اور بولے " چلے جائیے "۔ کمرے میں جوش صاحب براجمان تھے اور ان کے چند ہوا خواہ اُنہیں گھیرے ہوئے تھے۔ جمیل صاحب نے گلڈ کی مختصر رُوداد سنائی اور جوش صاحب سے شرکت کی استدعا کی۔ بولے " ضرور، ضرور۔ مگر آپ آکر مجھے لے جائیں "۔ جمیل صاحب نے کہا " میں خود آکر آپ کو لے جاؤں گا "۔ مگر وقتِ مقررہ پر جب جمیل صاحب انہیں لینے گئے تو بے نیل مرام واپس آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جو لوگ انہیں گھیرے رہتے ہیں انہوں نے جوش صاحب کو یہ کہہ کر پُھسلا دیا کہ گلڈ کی طرف سے آپ کو کوئی عہدہ تو پیش کیا ہی نہیں گیا۔ اس صورت میں آپ کا جانا مناسب نہیں۔ دوسرے دن الیکشن ہونے والا تھا۔ اس میں پانچ چھ سو ادیب اور شاعر عہدیداروں اور مجلسِ عاملہ وغیرہ کا انتخاب کرنے والے تھے۔ گھر بیٹھے جوش صاحب کو عہدہ کون دے جاتا؟ چنانچہ آج تک جوش صاحب گلڈ کے ممبر

نہیں ہے اور ان کے دل میں یہی سمائی ہوئی ہے کہ انہیں گلڈ میں کوئی بڑا عہدہ ملنا چاہیئے۔ گویا گلڈ میں عہدوں کی خیرات بٹ رہی ہے جس کی تقسیم اُن کے گھر سے شروع ہونی چاہیئے۔ بہت سی خرابیاں ہیں جوش صاحب میں۔ خرابیاں سب میں ہوتی ہیں، کسی میں کم، کسی میں زیادہ۔ مگر اپنی تمام خرابیوں کے باوجود جوش ایک مقناطیسی شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن سے طبیعت متنفر نہیں ہوتی، اُن سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ شعر کا تو اُن کے جواب ہی نہیں ہے۔ مشاعروں میں جب وہ پڑھتے ہیں تو سب کے چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ باتیں بھی بھولی بھولی اور مزے دار کرتے ہیں، بس ـــ وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی۔ ایک پٹا ہوا مفلس شاعر پاکستان میں اُن سے لپٹ گیا۔ کبھی حیدرآباد میں بھی اُن کی جان کو آیا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ اللہ اس کی روح کو نہ شرمائے مرحوم بڑا ہی بے غیرت تھا۔ جوش صاحب نے اس کا نام ہی کتا رکھ دیا تھا۔ سنٹرل ہوٹل میں جوش صاحب کو کسی نے عصرانہ دیا۔ عصرانہ ختم ہوا، جوش صاحب نے اپنا کلام سُنانا شروع کیا کہ مرحوم سپڑ سپڑ کرتا آ پہنچا۔ جوش صاحب نے میزبان سے کہا "دیکھو، وہ کتا آیا ہے۔ اُسے کچھ کھانے کو دو۔" کتے نے خوب سیر ہو کر کھایا اور داد دینے آ بیٹھا۔ مرحوم ہر فن مولا تھا۔ نثر بھی لکھتا تھا، شعر بھی کہتا تھا، نیز یزید کی تعریف میں ایک پوری کتاب بھی اس نے لکھی تھی۔ جسے چھاپنے کے لئے اُسے کوئی پبلشر نہیں ملتا تھا۔ گانے بجانے میں بھی کچھ دخل تھا۔ کھانا بھی پکا لیتا تھا۔ ایک دفعہ جوش صاحب سے بولا۔

"مچھلی تو کبھی میں آپ کو پکا کر کھلاؤں گا۔ آپ اُنگلیاں ہی چاٹتے رہ جائیں گے۔"

"ارے بھئی تو کھلاؤ نا کسی دن۔"

"کل ہی لیجئے۔"

اگلے دن وہ مچھلی پکا کر لے آیا۔ اچھی پکائی تھی، مگر چلتے وقت پتیلی کے ساتھ سولہ روپے کچھ آنے بھی لاگت کے جوش صاحب سے لے گیا۔

جوش صاحب جس گھن گرج کے شعر کہتے ہیں پڑھتے بھی اُسی گھن گرج سے ہیں۔ روزانہ صبح کو باقاعدگی سے شعر کہتے ہیں۔ شائقین ان کا کلام سُننے کیلئے بیتاب رہتے ہیں۔ آج تک کوئی پھسپھسا شعر اُن کا نہیں سُنا۔ سابق چیف کمشنر نقوی نے سابق صدر سکندر مرزا کو باور کرا دیا تھا کہ جوش اُردو کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ یہ لطیفہ حکومت کے ایک بڑے عہدہ دار نے سُنایا کہ کوئی وزیر قسم کا انگریز پاکستان آیا ہوا تھا۔ ایوانِ صدر میں ان کے اعزاز میں ڈنر تھا۔ معزز مہمانوں میں جوش صاحب بھی شامل تھے۔ آج کل تو کھڑا کھانا (بوفے) ہوتا ہے۔ کھاتے بھی جاؤ اور ٹہل ٹہل کر مہمانوں سے باتیں بھی کرتے جاؤ۔ معزز مہمان کے ساتھ ٹہلتے ہوئے سکندر مرزا جوش صاحب کے قریب آ گئے۔ جوش صاحب کا نام تو انہیں یاد نہ آیا تعارف کراتے ہوئے بولے:-

"MEET THE' GREATEST POET OF URDU."

وہ بھی ایک ہی بوجھ بُجھکڑ تھا۔ ہاتھ بڑھا کر بولا:-

"OH I SEE! SO YOU ARE MR GHALIB."

انجمن دانشورانِ ادب کے صدر جناب عبدالخالق عبدالرزاق ایک قابل اور علم دوست آدمی ہیں۔ اصل وطن تو دلی تھا مگر سالہا سال سے کراچی میں رہتے ہیں۔ سگریٹ کنگ کہلاتے ہیں۔ مہینے دو مہینے میں ان کے ہاں ایک پُر تکلف دعوت ہوتی ہے جس میں پندرہ بیس ممبر اور دو چار اعزازی مہمان شریک ہوتے ہیں۔ اتفاق سے اس انجمن کے تقریباً تمام ممبر خوش خور بھی ہیں (سوائے جنابِ صدر کے، جو کھاتے کم ہیں مگر کھلا کر زیادہ خوش ہوتے ہیں) لہٰذا شیخ صاحب کھانے کا نت نیا اہتمام کرتے ہیں۔ کبھی بریانی اور قورمے کی دعوت ہوتی ہے، کبھی سیخ کے کباب اور پوریوں کی، کبھی مُرغ مُسلّم کی، اور کبھی آموں کی۔ جاڑوں میں نہاری اور پایوں کی دعوت ہوتی ہے کبھی کبھی اس میں جوش صاحب بھی شریک ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب ان کے قدر دان اور ناز بردار ہیں، اس لئے ان کے لئے عمدہ سے عمدہ شراب بھی منگواتے ہیں۔ مغرب کے بعد ہی مہمان جمع ہو جاتے ہیں۔ فضلی، ماہر القادری، محمد تقی، رئیس امروہوی، جون ایلیا، رازق الخیری، اے ڈی اظہر، صہبا لکھنوی، ممتاز حسین، شان الحق حقی، الطاف گوہر، مہاجر صاحب اور کئی اور حضرات جن کے نام اس وقت یاد نہیں آ رہے۔ شیخ صاحب کی کوٹھی کے کشادہ سر سبز صحن میں بیضوی حلقے میں کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ مہمان آتے جاتے ہیں اور بیٹھتے جاتے ہیں۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی ہیں۔ جوش صاحب کی میز الگ ایک طرف کو لگی ہوئی ہے۔ شراب

کی بوتل ہے، سوڈا ہے، تھرمس میں برف کی ڈلیاں ہیں۔ دو گلاس ہیں۔ ایک ٹائم پیس بھی میز پر دھری ہوئی ہے۔ کیونکہ جوش صاحب گھڑی دیکھ کر پیا کرتے ہیں۔ وقت ختم ہوا شراب کا دور ختم ہوا۔ مجاز مرحوم کو بھی جوش صاحب نے نصیحت کی تھی کہ میاں گھڑی رکھ کر پیا کرو۔ اُس بلا نوش نے جواب میں کہا تھا کہ "میرا بس چلے تو گھڑا رکھ کر پیوں"

جوش صاحب کا ساتھ دینے کیلئے ایک اور صاحب جا بیٹھے ہیں۔ جوش پیتے رہتے ہیں، یہ چسکی لگاتے رہتے ہیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں جوش صاحب پانچ چھ گلاس پی جاتے ہیں، یہ دو ہی میں چھپ جاتے ہیں اور جب کھڑے ہوتے ہیں تو ان کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگتی ہیں۔ جوش صاحب میں کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا۔ کھانے کا وقت ہو گیا۔ لمبی میز پر کھانا چُنا گیا۔ کھرا کھانا بھی ہوتا ہے اور میٹھا کھانا بھی۔ جوش صاحب کا کھانا اُن ہی کی میز پر پہنچ گیا۔ ماشاء اللہ خوش خور ہیں۔ جبھی تو ستر سال کی عمر میں بھی ٹانٹے بنے ہوئے ہیں۔ سچ ہے "ایک ڈاڑھ چلے، ستر بلا ٹلے" شیخ صاحب ایک ایک کے پاس جا کر کہتے ہیں۔ "آپ نے یہ تو لیا ہی نہیں" "آپ تو کچھ کھا ہی نہیں رہے" "بھائی آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ لیجئے نا" اصرار کر کر کے سب کو کھلا رہے ہیں۔ "شیخ صاحب، آپ بھی تو کچھ لیجئے نا" "جی ہاں، میں بھی کھا رہا ہوں" یہ کہہ کر اُنہوں نے کچھ چینگ لیا اور آگے بڑھ گئے۔ ماہر القادری کھانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔ یعنی اتنا کہ اس کے بعد مزید انصاف کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ اتنے میں برف میں لگے ہوئے آم آ جاتے ہیں۔ تو مولانا تاسف سے فرماتے ہیں۔ "ارے! یہ تو پہلے بتا دینا چاہیے تھا کہ آم بھی ہیں" میں نے کہا "یہی تو نقصان ہے مولانا شارٹ ہینڈ میں کھانے میں" اور صہبا کہتے ہیں "قوم کا نقصان کر دیا شیخ صاحب نے" پھر قوم آموں پر دست درازی کرتی ہے مگر مولانا ماہر القادری بھی تین دانوں سے زیادہ نہیں کھا سکتے۔ آموں سے نمٹنے نہیں پاتے کہ آئس کریم آ جاتی ہے۔ مولانا افسردگی سے کہتے ہیں "لیجئے ابھی یہ بھی باقی ہے" اس کے لئے بھی کہیں نہ کہیں گنجائش نکل آتی ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر سب کرسیوں کے حلقے میں آ بیٹھتے ہیں۔ جوش صاحب بھی حلقے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان کے دائیں ہاتھ سے شعر خوانی کا چکر چلتا ہے۔ شاعر اپنا اپنا کلام سناتے ہیں۔ آخر میں جوش صاحب کا نمبر آتا ہے۔ وہ خوب اسٹیم بھر چکے ہیں۔ ایک بیاض سامنے رکھ کر شروع ہو جاتے ہیں۔ کس بلا کا کلام ہے! سننے والے پھڑک پھڑک کر داد دیتے ہیں۔ بیسیوں بند کی طویل نظم ہے مگر اکھڑتی نہیں۔ جی یہی چاہتا ہے کہ نظم کبھی ختم نہ ہو اور ماشاء اللہ کتنی جان ہے پڑھنے والے میں، پوری آواز سے پڑھتے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا۔ آواز کھرکھرائی تک نہیں۔ کیا اس شاعر کا یہی ایک وصف ایسا نہیں کہ اس کے تمام عیوب کو نظر انداز کر کے اسے گلے لگا لیا جائے۔؟

ع نازت بکشم کہ نازنینی

ناشر	شمس زبیری
سرورق	ناظن
کتابت	وقیع الحسن
اشاعت	جولائی سنہ ۶۲ء
مقام اشاعت	کاشانۂ اردو
	۶/۲ اکبر روڈ کراچی
طباعت	انٹرنیشنل پریس کراچی

DURA-GLOSS
Nail Polish
MADE IN U.S.A.
ڈوراجلوس
ناخون کی پالش
تزئین حسن کے لئے
ناخون کی آرائش ضروری ہے
ڈوراجلوس
خوش رنگ۔ دیدہ زیب۔ چمکدار اور
خوشبودار پالش ہے۔
امریکہ میں بنی ہوئی
ہر بڑے دوکاندار سے ملتی ہے۔

سید فیضی
ہم قلم (کراچی)

میں تماشہ ہوں تماشائی بھی!

کون کہتا ہے کہ فنکار ہوں میں
فکر و احساس کا مارا ہوا اک انسان ہوں
جس کے ٹوٹے ہوئے معصوم سے نازک دل پر
صاف ابھرے ہوئے آتے ہیں نظر
چند بے نام سی چوٹوں کے نشاں ——
اور لوگ ——

میرے آئینۂ ہستی کی ضیا تابی میں
دیکھ کر عکس خود اپنا یہ سمجھ لیتے ہیں
جیسے فنکار ہوں میں!
کیا اسے ندرت تخیل کہوں
یا گرانباریٔ ذہن ——
سینکڑوں نغمے گھٹا بن کے برس پڑتے ہیں
نغمے ہنستے ہوئے، روتے ہوئے، مغموم، اداس!!
زندگی ۔ ایک ادا پر مفتوں
کائنات —— ایک تبسم پہ نثار
نکہتیں بھی مری شاداب نگاہی کا فسوں
جیسے موجوں میں لرزتا ہوا پندار سکوں
جیسے بازی گر فطرت کا طلسمی ہیجان
پھیلتی راہوں میں دیوار سی حائل کر دے۔
جیسے بے نام خوابوں میں کوئی اتر اکر
اک نہ اک رنگ حقیقت بھر دے!!
کالی چادر پہ چمکتے ہوئے موتی —— اور میں
بکھری بکھری ہوئی زلفوں کے گھنے سایوں میں
لرزش موجۂ انوار سے تابندہ ہوں۔
مضمحل ہے یہ پر اسرار خموشی لیکن
ایک ہنگامۂ محشر ہے بپا
کہیں ہنسنے کہیں رونے کی صدا ——
کتنی صدیوں سے مرے ذہن کی شورش کا مزاج
ان مسائل سے الجھتا ہی رہا!
قہقہے میرے ہیں اور بھیگے ہوئے یہ آنسو
غم کے ماتھے سے جو ٹپکے ہیں پسینہ بن کر
میرے ہیں ۔ اور یہ فضائیں کہ جہاں
پھول کے ساتھ ہی کانٹے بھی لگے رہتے ہیں
جہاں طوفان بھی چشموں کی طرح بہتے ہیں
زخمۂ شوق سے چھڑتا ہے جہاں دل کا رباب
سسکیاں بن کے پگھلتا ہے جہاں عہد شباب
برق پاروں سے الجھتی ہے جہاں طبع رواں

چاند بھی اپنی جوانی کو لٹاتا ہے جہاں
سب کے سب میرے ہیں
میں خالقِ رعنائی ہوں
وقت ہے میرا تماشہ میں تماشائی ہوں۔
میری آنکھوں میں دہکتی ہوئی زیبائی ہے
میں خدا ہوں! مری تخلیق میں پیدائی ہے
میرے ماحول نے فطرت سے جلا پائی ہے
میری جو بات ہے اعجازِ مسیحائی ہے
میرا ہر شعر وہ روتا ہوا نغمہ ہے جسے
خلشِ خار سے بے وقت ہنسی آئی ہے
سسکیاں بھی مری چیخوں کا اثر رکھتی ہیں
اور یہ میرا تبسم تو خدا جانے کیا ——!
دیکھ یہ حلقۂ گرداب ہے یا موجیں ہیں
روز اٹھتا ہے یہ طوفان مرے سینے میں
میں سمندر ہوں ——
سمندر تو مگر
گھٹتے بڑھتے ہوئے آسودۂ ساحل ہی رہا
اور میں —— ؟
میری آنکھیں نہیں میں پیکرِ بینائی ہوں
راہ چلتے ہوئے بڑھتے ہوئے لاکھوں منظر
(جن میں نیلام بھی شامل ہے مرے گیتوں کا)
چھوڑتے جاتے ہیں میرے لئے قدموں کے نشاں
وقت بدلے کہ تڑپتا رہے فرسودہ نظام
اس چمکتے ہوئے سورج کی قسم
میری قسمت ہے سر افگندہ، خموش
اپنے دامن میں ہمکتے ہوئے طوفان لئے
اپنی منزل پہ شب و روز نظر رکھتا ہوں
جانے کیا بات مری فطرتِ فنکار میں ہے
میں اگر چاہوں تو انگاروں پہ نیند آ جائے
میں اگر چاہوں تو کانٹوں سے گزارا کر لوں
یہ بھی ممکن ہے سویرا ہو جائے
فرشِ مخمل پہ مجھے کروٹیں لیتے لیتے۔
میری آواز میں رس ہے مری آہوں میں اثر
میں گنہگار نہیں ——
ایک شفاف سا آئینہ ہوں جس میں ہر عکس
اپنی فطرت کے مطابق ہی ڈھلا کرتا ہے
وہ شرر ہوں کہ مرا ذوقِ تپش اپنا کر
اک زمانہ مری مانند جلا کرتا ہے
میرے انفاس میں مضمر ہے نمودِ مہ و سال
میری ہر بات کو وقت اپنی کہا کرتا ہے
کون ہے جو مری پرواز کو محدود کرے
اور میں نے تو محبت کی ہے!

محمود ایاز — سوغات (بنگلور)

جلاوطن

سحر و شام نے سو رنگ سے کی جلوہ گری

میں نے ہر رنگ میں اک جلوۂ یکتا ڈھونڈھا

جس کی تصویر صنم خانۂ عالم میں نہیں!

میں نے ہر خواب میں وہ روئے دل آرا دیکھا

خواب کی دھند میں چلتا رہا منزل منزل

اپنی ہی آگ میں جلتا رہا تنہا تنہا

عمر بھر اپنی ہی تخئیل کے پیکر پوجے

رگِ احساس میں خود زہر کا نشتر رکھا

جب کے شعلوں میں جلی راحتِ عالم کی طلب

میں نے جاں دے کے اس اک آگ کو روشن رکھا

دل کی تسکین کے عنواں بہت تھے لیکن

میں نے اے حسنِ گریزاں! ترا دامن تھاما!!

عرش صدیقی — ادبِ لطیف (لاہور)

لیلائے فن کے نام

میں نے تیرے روپ کی خاطر گوندھے تشبیہوں کے ہار
تیرے نام کی لَو کو میں نے پہنائے شعروں کے تاج
تیری مانگ میں مَیں نے ڈالا تاروں کا اُجلا سیندور
جس کے نورِ رواں کے آگے کاہکشاں کو آئے لاج

دیوی، تیری زلف کو سمجھا، خوابوں کا رُوپہلا جال
اور ترے ہونٹوں کو جانا لال گلاب کے تازہ پھُول
تیرے نام گذرگاہوں پر اپنے خون سے سینچی دُوب
اور اپنے بالوں میں ڈالی روز ترے قدموں کی دھُول

دل کے ساگر سے میں لایا جذبوں کے موتی انمول
سر سے خیال کی لڑیاں لے کر سہرے پروئے کتنی بار
جیون امرت یوں ٹپکایا جیسے نازک گھاس پہ اوس
اور ترے ماتھے پہ سجائے جگمگ کرتے یہ سب ہار

رنگا رنگ قبائیں میں نے تیرے جسم کو پہنائیں!
اپنے بدن کا جی ترسایا ڈال کے اُس پر اُلجھے تار
خونِ جگر کے اشک بنائے اور دھلائے تیرے ہاتھ
نینوں کی سب جوت تجھے دی تا کہ سجے تیرا گھر بار

تیرا داس بنا پر تو نے بھیک نہ دی مجھ کو اک بار
پھر بھی آشا ساتھ ہے کھوئے بیٹھا ہوں ہر دے کا دوار

بلراج کومل — ادبِ لطیف (لاہور)

شہرِ ویراں

اُس کھنڈر کے قریں
گوشۂ بے زباں کو جہاں چومتی ہے یہ بوڑھی زمیں
آج آئیں گے پائمال
رنگیں بہاروں سے بچھڑے ہوئے
سب رفیقانِ غم
آتشِ نغمۂ گل جلے گی وہاں
مسکرائے گی اور خون روئے گی مجبور شمع زباں

شہرِ ویراں ہیں ہم
اجنبی تو نہیں
ہم بھی رنگیں بہاروں سے بچھڑے ہوئے
بے اماں لوگ ہیں
بے زباں لوگ ہیں

آج ہم بھی چلیں
اس کھنڈر کے قریں
ہمدموں سے ملیں
گوشۂ بے زباں کا فسانہ سُنیں
اور ساغر بکف
آتشِ جذبۂ بے کراں میں جلیں

ادیب سہیل — افکار (کراچی)

یزداں محبوس، اہرمن آزاد

شہر سُنسان ہے رستہ ویران
رات کے سینے سے رستہ ہے سکوت
منجمد جیسے لہو کا قطرہ
کس قدر وقت کے بوجھل ہیں قدم
جیسے ہر پل میں سموئے ہوئے صدہا لمحات
بھاری بوٹوں کی گذرتی آواز
سگِ آوارہ کے رونے کی صدا
رات کو اور بھی پُرہول کئے دیتی ہے

چند قاتل جو سدا رہتے ہیں سب پر حاوی
چند قاتل کہ ہیں جن کے آگے
حرفِ بے معنی ہے شہری آداب
وہ ہوں داروغۂ تنظیم کہ اعلیٰ شہری
سب کو معلوم ہیں ان کے افعال
کون سی مصلحت اندیشی ہے جس کے باعث
سدِ باب ان کا کوئی کرنے کو بڑھتا ہی نہیں

کیا تماشہ ہے کہ قاتل آزاد
کو بہ کو، تشنۂ خوں، سونگھتا پھرتا ہے لہو
اور زندانئ خانہ ہیں سکوں کے خواہاں
نیند کھوئے ہوئے اور دل کے دھڑکنے کی ادا بھولے ہوئے
منتظر در پہ لگائے ہوئے کان
کب کسی بوٹ کی چاپ ابھرے — پکڑ کر لے جائے۔
اِن کو ناکردہ گناہوں کی سزا دلوانے

خلیل الرحمن اعظمی — صحیفہ (لاہور)

ہنگامۂ حیات سے جاں بر نہ ہو سکا
یہ دل عجیب دل ہے کہ پتھر نہ ہو سکا

میرا لہو بھی پی کے نہ دُنیا جواں ہوئی
قیمت مرے جنُوں کی مرا سر نہ ہو سکا

تیری گلی سے چھُوٹ کے نہ جائے اماں ملی
اب کے تو میرا گھر بھی مرا گھر نہ ہو سکا

تیرے نہ ہو سکے تو کسی کے نہ ہو سکے
یہ کاروبارِ شوق مکرّر نہ ہو سکا

یوں جی بہل گیا ہے تری یاد سے مگر
تیرا خیال تیرے برابر نہ ہو سکا

گزری جو شب تو بجھ گئے اپنے چراغ بھی
آئی سحر تو پھر کوئی رہبر نہ ہو سکا

یاور عباس — ساقی (کراچی)

کس قدر ملتے ہوئے نغمے ہیں ہر اک ساز کے
ہیں مگر پہچاننے والے ابھی آواز کے

وقت کی مضراب نے یوں تار چھیڑے ساز کے
لے کے سو ٹکڑے ہوئے اور سینکڑوں آواز کے

خواہشِ پرواز شاید بال و پر کا نام تھا
دل اُڑا جاتا ہے اب تو نام سے پرواز کے

کس قدر نغمے ہیں جو آواز بن سکتے نہیں
تار اب تک مرتعش ہیں اس شکستہ ساز کے

ایک ہی آوازِ ساقی کوئی چونکا کوئی گم
مختلف پہلو ہوا کرتے ہیں ہر آواز کے

قلقلِ مینا ہے شاید سختیِ دوراں کی لے
قہقہے پردے ہیں شاید دردِ بے انداز کے

ہم گرفتارِ بلا زنجیر کھڑکاتے چلے
دُور تک چرچے ہوئے زنجیر کی آواز کے

مُنکرینِ جذبۂ دل، جذبۂ دل دیکھ لیں
خود بہ خود اٹھنے لگے پردے حریمِ ناز کے

کوئی لے باقی رہی اس میں نہ اب نغمہ کوئی
لوگ عادی ہیں مگر یاور تری آواز کے

طفیل احمد جمالی — ہم قلم (کراچی)

پھر ہوئے بدنام، کہلانے لگے فرزانہ ہم
پھر کسی بستی میں آ نکلے دلِ دیوانہ ہم

ایک تنہا دل، بھٹکتی روح، اک پیاسی نظر
اے جنوں تیرے لئے لائے ہیں کیا ویرانہ ہم

تیشۂ فرہاد سے لے کر بہر دورِ فلک
آج تک دہرا رہے ہیں ایک ہی افسانہ ہم

انقلابِ میکدہ کی بات یوں کرتے ہیں لوگ
جیسے ہوں ناآشنائے ساقیٔ میخانہ ہم

اُس جہانِ دوش و فردا و بلند و پست سے
کتنی دُور اور آ گئے اے لغزشِ مستانہ ہم

منظرِ دار و رسن میں ہم اُلجھ کر رہ گئے
ورنہ نکلے تھے بعزمِ کوچۂ جانانہ ہم

چاند تاروں کے کھلونے مانگتے ہیں چرخ سے
اے جمالی لائے ہیں کیا فطرتِ طفلانہ ہم

شہرت بخاری — نئی قدریں (حیدرآباد پاک)

کرم ہو یا ستم سمجھا نہ جائے
سوئے منزل کوئی رستہ نہ جائے

تمیزِ شہر و صحرا اُٹھ گئی ہے
کہاں ٹھہرے، کدھر دیوانہ جائے

قیامت ہے تری آواز پر بھی
دلِ بے تاب سے دھڑکا نہ جائے

یہ کیسا ابر ہے جس سے کہیں بھی
سمندر کے سوا برسا نہ جائے

غمِ عقبیٰ، غمِ جاناں، غمِ جاں
کسی غم سے غمِ دُنیا نہ جائے

نقاب آہستہ آہستہ اٹھانا
دل اک دیوانہ ہے گھبرا نہ جائے

ہنسیں گے کیا تجھے مل کر وہ جن سے
خود اپنے حال پر رویا نہ جائے

گھٹا جاتا ہے گو اس بھیڑ میں دم
مگر اس بھیڑ کو چھوڑا نہ جائے

ترانہ ہو، غزل ہو، داستاں ہو
ترے بیمار سے بہلا نہ جائے

کسی دیوار کے سائے میں شہرت
شکستہ پا ہوں پر ٹھہرا نہ جائے

یوسف جمال انصاری　　کامران (سرگودھا)　　ساحر ہوشیارپوری　　پگڈنڈی (امرتسر)

حُسن کے ناز اٹھائے کیوں، عشق کو آزمائے کیوں
گُم ہو جو اپنے آپ میں اور سے جی لگائے کیوں

نکہت و رنگ سے جُدا سینۂ گُل کا ہے خلا!
دامِ تعینات میں جلوۂ حُسن آئے کیوں

دشتِ خیال و کوہِ غم دل ہی میں ہوں اگر بہم
راہیِ منزلِ صنم آپ سے دور جائے کیوں

عشق و ہوس میں کب ہوئی نام کو بھی کبھی دوئی
دستِ طلب سے پھر کوئی دامنِ دل بچائے کیوں

سینے میں کب سے متصل آتشِ غم ہے مشتعل
گردشِ روزگار کا دل کو یقین آئے کیوں

آپ سے ہم گذر گئے جسکی خوشی کے واسطے
یاد میں وہ سمائے کیوں، خواب میں مسکرائے کیوں

درد سے دل ہوا ہے خوں ضبط سے نیم جاں تو ہیں
اور بھی امتحاں تو ہیں، یوں وہ ہمیں ستائے کیوں

خود وہ آتے اگر یقین ہوتا
درد پرسش طلب نہیں ہوتا

سجدہ کرتے ہزار بار، مگر
کوئی در لائقِ جبیں ہوتا

دل تو کیا جان تک فدا کرتے
تُم سا لیکن کوئی حسیں ہوتا

تیرے وعدوں پہ بھی یقیں کرتے
ہم کو دل پر اگر یقیں ہوتا

بادہ مرغوبِ دل ہے تلخی سے
زہر ہوتا جو انگبیں ہوتا

دل پہ جبتک نہ اسکے چوٹ آئے
آدمی کام کا نہیں ہوتا

اس میں شامل جو ہوتا ذکر اُن کا
یہ فسانہ بڑا حسیں ہوتا

ہستیِ بے ثبات کا ساحر
نقش کوئی تو دل نشیں ہوتا

عبیداللہ علیم — الشجاع (کراچی)

عشوہ و غمزہ و رم بھول گئے
تیری ہر بات کو ہم بھول گئے

لوگ دیتے ہیں جسے پیار کا نام
ایک دھوکا تھا کہ ہم بھول گئے

جن کو دعوے تھا مسیحائی کا
اپنا ہی دیدۂ نم بھول گئے

یونہی الزام ہے دیوانوں پر
کب ہوئے تھے جو کرم بھول گئے

جانے کیوں لوگ ہنسا کرتے ہیں
جانے ہم کون غم بھول گئے

اب تو جینے دو زمانے والو
اب تو اس زلف کے خم بھول گئے

زندگی نے جو سکھایا تھا علیم
زندگی کے لئے ہم بھول گئے

فاضل زیدی — پگڈنڈی (امرتسر)

وہ شوخ ادا بھی ہیں وہ معصوم ادا بھی
کھلتا نہیں کچھ حال طبیعت کا ذرا بھی

یوں مجھ پہ کرم کرتے ہیں گویا ہیں خفا بھی
یہ اُن کا ستم بھی ہے محبت بھی ادا بھی

کیا جانئے دل کون سے انداز پہ آیا
شوخی بھی ہے ظالم کی نگاہوں میں حیا بھی

ایمان کا دشمن بھی ہے تو او بُتِ کافر
تجھ میں نظر آتی ہے ہمیں شانِ خدا بھی

ہم دوڑ کے سینے سے لگا لیں اسے فاضل
آئے اگر اُس شوخ کی صورت میں قضا بھی

کوثر چاند پوری

آجکل دہلی

سہرا

ہندوستانی مسلمانوں میں شادی بیاہ کے موقع پر جن رسوم کی پابندی کی جاتی ہے ان میں سے بعض ایسی ہیں جو مغل بادشاہوں کے ساتھ آئی تھیں۔ مثلاً ساچق اور حنابندی وغیرہ بعض ایسی ہیں جن کو اہل ہند کی دل جوئی اور ان سے میل جول بڑھانے کی غرض سے اختیار کر لیا گیا تھا۔ مثلاً منگنی اور سہرا یا ایسی ہی دوسری رسمیں۔ کچھ رسمیں ایسی بھی ہیں جن کو ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے مذہبی ماحول کو سامنے رکھ کر ہندوستان ہی میں ایجاد کر لیا تھا۔ جیسے بوبی کی صحنک، جس کو متبرک سمجھ کر شادی کا پیش خیمہ قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت یہ کہ جہانگیر کی چہیتی بیوی اجودھیا بائی راجپوت قوم سے تعلق رکھتی تھی، نورجہاں بیگم سے خوش نہ تھی نورجہاں اسے دہقان زادی کے نام سے یاد کیا کرتی تھی اور اکثر اسی طرح چھیڑا کرتی تھی۔ اجودھیا بائی نے تنگ آکر حضرت خاتون جنتؓ کے نام سے فاتحہ دلانے کا آغاز کیا اس کی صورت یہ تجویز کی گئی کہ کوری صحنکوں میں نیاز کا کھانا جمایا جاتا تھا جو نیک اور سہاگن عورتوں ہی کو کھلایا جاتا تھا۔ جو لوگ بلائے جاتے تھے وہ پاک و صاف ہو کر کھانے میں شریک ہوتے تھے۔ اجودھیا بائی نے بوبی کی صحنک پر یہ اعلان کر دیا کہ ایسی تمام بیگمات شرکت کر سکتی ہیں جو اپنے شوہروں پر قائم ہوں۔ نورجہاں شہنشاہ جہانگیر کی نہایت محبوب بیوی ضرور تھی لیکن شیر افگن کے قتل ہو جانے پر وہ اس کے عقد میں آئی تھی اس لئے اجودھیا بائی کی شرط پوری نہ اترتی تھی۔ چنانچہ وہ شریک نہ ہو سکی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ نورجہاں نے اجودھیا بائی کو دہقان زادی کہنا چھوڑ دیا، اسی وقت سے یہ رسم رائج ہے اور شادی نیز ہر اچھے کام کے شروع میں ادا کی جاتی ہے۔[1]

اجودھیا بائی نے شادی کے بعد اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا وہ آخر تک ہندو ہی رہی اس لئے ظاہر ہے کہ یہ رسم کسی مسلمان کے مشورے سے معرض وجود میں آئی ہوگی۔ بہت سی رسمیں اکبر نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں سے اتحاد کی خاطر اپنا لی تھیں۔ اکبر مغل بادشاہوں میں سب سے زیادہ روشن خیال اور اتحاد پسند تھا۔ وہ مذہب کی بنا پر حکومت کرنا پسند نہیں کرتا تھا نہ کسی فرد رعایا پر زیادتی روا رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دربار میں بہت سے ایسے قاعدے جاری کئے۔ جو ہندو راجاؤں کے ساتھ مخصوص تھے۔ ہندوؤں سے جزیہ لینے کا طریقہ بھی اسی کے حکم سے بند ہوا۔ شادی کے سلسلے میں اس نے چند قوانین نافذ کئے تھے جن کی نگرانی کے لئے "طوی بیگی" کے نام سے ایک عہدیدار مقرر کر دیا گیا تھا[2]

---

[1] تاریخ النوائط صفحہ ۹۱۔ [2] آئین اکبری جلد اول صفحہ ۱۹۵ طوی ترکی زبان کا لفظ ہے فارسی میں "توی" بھی لکھا جاتا ہے۔

سہرے کا رواج عجمی مسلمانوں میں کبھی نہیں رہا۔ یہ خالص ہندوستانی رسم ہے، یہاں تک کہ اس لفظ ہی کو فارسی کا لفظ نہیں سمجھا گیا اور اکثر فارسی لغات مثلاً برہانِ قاطع، منتخب اللغات اور غیاث اللغات وغیرہ میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اپنی ترکیب کے لحاظ سے "سہرا" یقیناً فارسی زبان کا لفظ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہندوستان ہی میں بنایا گیا ہو۔ چنانچہ امتیاز خاں خالص نے جو صفاہانی اور ایرانی الاصل تھا ایک شعر میں اسے نظم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے

ماہ من از حیا رخش بسکہ آب و تاب شد[۱]   سہرہ چو بست عارضش پنجۂ آفتاب شد

یہ واضح رہے کہ امتیاز خاں خالص اورنگ زیب کی طرف سے صوبۂ عظیم آباد کا دیوان تھا اور شاہ عالم کے عہد حکومت میں ایران جاتے ہوئے خدایار خاں مرزبان سندھ کے اشارے سے قتل کیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۱۲۲ھ کا ہے[۲]

امتیاز خاں خالص پیدائش کے لحاظ سے ایرانی ضرور تھا لیکن عرصہ تک ہندوستان میں رہا تھا یہاں کے رسم و رواج سے بھی اس نے آگاہی حاصل کر لی ہوگی۔ اس نے اپنے شعر میں جس کیفیت کا اظہار کیا ہے اس کا مشاہدہ ہندوستان ہی میں ہو سکتا تھا کیونکہ ایران میں سہرا باندھا ہی نہ جاتا تھا سو وہاں کسی محبوب کو وہ شدتِ حیا سے پنجۂ آفتاب بنتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور بغیر دیکھے اس کیفیت کی عکاسی ممکن نہ تھی۔ بہرحال اورنگ زیب کے زمانے میں "سہرے" کا لفظ فارسی اہل زبان نے قبول کر لیا تھا۔ رسم کے اعتبار سے "سہرا" باندھنے کا دستور کافی قدیم تھا۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گا اور اس کی حیثیت بالکل مذہبی تھی، البتہ اس بات کا ثبوت مجھے نہیں مل سکا کہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے دورِ حکومت میں بھی کسی شاعر نے سہرے کا لفظ استعمال کیا یا نہیں۔ میں نے ان ادوار کے اکثر شعراء کا کلام دیکھا۔ مگر "سہرا" کہیں نہیں ملا۔ بہت ممکن ہے کہ خالص ہی کے زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے یہ لفظ بنایا گیا ہو۔ اربابِ تحقیق نے "سہرے" پر مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے

سہرا موتیوں، مقیش کے تاروں یا صرف پھول کی لڑیوں سے بنایا جاتا ہے اور دولہا کے سر پر شب گشت کے وقت اور دلہن کے سر پر جلوے یعنی رونمائی کے وقت نقاب کے طور پر باندھا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں سہرے کی رسم مذہبی حیثیت رکھتی ہے اور احکام شاستر کے پیش نظر ادا کی جاتی ہے اس کا مقصد محض دولہا دلہن کے چہروں کو نگاہوں سے مخفی رکھنا ہے۔ شاستر کی رو سے شادی کے وقت دولہا اور دلہن کو معمولی انسان نہیں سمجھا جاتا بلکہ قدرتِ الٰہی کا مظہر خیال کیا جاتا ہے اسی لئے دلہن کو لکشمی اور دولہا کو پرمیشر سے موسوم کیا گیا ہے کیونکہ انھیں دونوں کی ذات افزائش نسل کی ضامن ہوتی ہے لیے چہرے کی نقاب سے ان کے چہروں کو پوشیدہ رکھ کر عوام کو شاستر کے عقیدے کی جانب متوجہ کرنا مقصود ہے۔ سہرا باندھنے کے موقع پر نیز شادی کی دوسری رسموں کی ادائیگی کے وقت شاعروں کی وہ جماعت جس کو بھاٹ کہتے ہیں دولہا کی تعریف میں اشعار پڑھا کرتی تھی اور چونکہ سہرا بھی شادی ہی کے سلسلے کی ایک رسم تھی اس لئے سہرے اور دولہا کے حسن و جمال کی تعریف بھی کی جاتی تھی یہی رواج بعد کو سہرے کی تعریف و توصیف میں مستقل طور پر نظمیں لکھنے کا محرک[۳] ہوا۔ سہرے کا مطلب وقتی تہنیت اور مبارکباد کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ کہنا بہت دشوار ہے کہ اردو میں سب سے پہلے سہرا کس نے لکھا اور کس کو اس کا موجد کہنا چاہیئے۔ لیکن اس کی ساخت کے اعتبار سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سہرا مرثیہ کے راستے سے اردو میں آیا ہے کم سے کم اس کی ساخت میں مرثیہ کا پورا اتباع کیا گیا۔ چنانچہ سہرا نوشہ کی پھبن کا بیان کیا جاتا ہے تو اسے حسب حال سہرا۔ مہندی، ساچق اور وداع کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور ان چاروں اقسام کا بیان عام طور پر مرثیوں میں ہوتا ہے[۴]

سہرے کی لفظی تحقیق کے سلسلے میں ارباب لغت کے بیانات بہت مختلف ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ سہرا اصل میں شوہر تھا پھر بگڑ کر شہو اور آخر میں سہرہ ہو گیا۔

[۱] بہارِ عجم۔ [۲] تذکرہ حسینی ص ۱۱۱ و شمع انجمن ص ۱۴۱۔ [۳] تاریخ النوائط ص ۹۱ [۴] مجموعۂ استفسار و جواب ص ۱۳ [۵] ۳۴۳ [۶] خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم۔

فرہنگ آصفیہ کے مصنف کی رائے میں سہرے کی اصل سرہار ہے کیونکہ سر، فرق کے معنی میں ہندی بول چال میں داخل ہے۔ جس کو ہار سے مرکب کر لیا گیا ہے۔ شروع میں اس کو سرہار کہا گیا ہوگا۔ پھر ہائے مہملہ کو گرا کر سہار، بنا لیا گیا ہوگا۔ اس کے بعد الف نے قلب مکانی کی منزل سے گزر کر اپنی جگہ تبدیل کر لی ہوگی اور اس طرح "سہرا" بن گیا ہوگا۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ سہرے کی اصل سہ ہار ہے۔ ممکن ہے شروع میں تین ہار کا سہرا باندھا جاتا ہو۔ اگرچہ سہ ہار اور "سہار" میں تھوڑا ہی فرق ہے اور یہ بات بھی خلاف قیاس نہیں ہے کہ ابتدا میں تین ہار کے سہرے کا رواج رہا ہو لیکن سہ ہار میں کہا جاتا ہے کہ ایک لفظ فارسی اور دوسرا ہندی ہے۔ یعنی ہار اور دو مختلف زبانوں کے الفاظ کو ملا کر اس طرح ایک مفرد لفظ بنا لینا صحیح نہیں۔

میری رائے میں یہ اعتراض سہرا اور سہ ہار کے اس رشتہ کو منقطع نہیں کرتا جو سب سے زیادہ قرین عقل ہے کیونکہ اوّل تو بہار عجم اور مجمع النفائس کے مصنفین نے لفظ ہار کو چاہے وہ موتیوں کی لڑی کے لئے استعمال کیا جائے چاہے پھولوں کے ہار کے لئے فارسی قرار دیا ہے اور ملّا منیر کے کلام سے استناد کیا گیا ہے جو کہتے ہیں۔

بہ ذکر خلق شاہنشاہ دوراں ز ہار گل ملائک سبحہ گرداں [۱]

ایک جگہ اور کہتے ہیں

گستہ ہار مروارید در بر [۲]

ہندی میں ہار کو مالا کہتے ہیں جس کی عربی "سبحہ" ہے اکبر نے پھولوں کے ہار کی جگہ پھول مالا رائج کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ لفظ مقبول نہ ہو سکا اور جہانگیر کی رام رنگی کی طرح زبان میں جذب ہونے سے رہ گیا۔ بہر کیف ہار کو عربی میں عقد اور ہندی میں مالا کہتے ہیں اور اس اعتبار سے سہرے کی اصل "سہ ہار" ہی کو تسلیم کر لینا زیادہ مناسب ہے۔

بہار عجم میں سہرے کو بھی فارسی قرار دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"سہرہ، بالکسر در اصل سیرا بیائے مجہول و آخر الف است چیزے باشد
کہ در ہند کہ از مروارید و از مقیش و از گلہا نیز سازند و ہنگام عروسی
بر سر داماد بندند۔"

امتیاز خاں خالص [۳] کا وہ شعر جو پہلے لکھا جا چکا ہے، صاحب بہار عجم نے اسی سلسلہ میں لکھا ہے۔

علامہ نیاز فتحپوری تحریر فرماتے ہیں کہ لفظ سہرا ممکن ہے کہ سنسکرت کے کسی لفظ کی بگڑی ہوئی صورت ہو یا پھر عربی سے لیا گیا ہو جس میں سہر کے معنی رات کو جاگنے کے ہیں اور سہرہ اس جلسے یا اجتماع کو کہتے ہیں جو شام کے وقت قائم کیا جائے [۴]

مجھے علامہ کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ سہرے کو سنسکرت میں "بھال سنگ" کہتے ہیں یہ دونوں الفاظ الگ الگ معنی رکھتے ہیں۔ بھال پیشانی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور "سنگ" دونوں کنپٹیوں کے درمیانی کے فاصلہ کو کہتے ہیں اس میں شک نہیں کہ سنسکرت کے اکثر الفاظ ذرا سے تغیر کے بعد اردو میں رائج ہو چکے ہیں مثلاً چندرما کی جگہ چاند اور سوریہ کی جگہ سورج لیکن بھال سنگ کو کتنا ہی مسخ کیا جائے اس سے "سہرا" نہیں بن سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ بھال "سنگ" کے معنی کو سامنے رکھ کر اس سے سرہار بنا لیا گیا ہو۔ جو پیشانی پر ایک کان سے دوسرے کان تک باندھا جاتا ہوگا پھر یہی لفظ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے "سہار" کی دیئی

---

[۱] بہار عجم جلد دوئم ص۲۵۴ [۲] مجمع النفائس [۳] بہار عجم جلد دوم ص۱۴۸ [۴] مجموعہ استفسار و جواب جلد اوّل ص۳۰۲

صورت سے گزر کر "سہرا" بن گیا ہو۔

رہا عربی الفاظ سہر اور سہرہ کا معاملہ تو اس کو بھی "سہرے" کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ "جلسۂ سہرہ" "رت جگے" کا مترادف ہو سکتا ہے سہرے کا نہیں اور شادی میں یہ رسوم جس ترتیب سے ادا کی جاتی ہیں اس کے اعتبار سے سہرے کا نمبر بہت بعد میں آتا ہے۔

شادی کی ابتدائی رسم، بیوی کی صحنک ہے۔ اس کے بعد رت جگا یعنی شب بیداری جو دولہا اور دولہن دونوں کے گھر منائی جاتی ہے۔ تیسرا نمبر منجھے کی رسم کا ہے پھر ساچق یعنی بری کا۔ یہ رسم ترکوں کے ساتھ باہر سے آئی ہے اور ساچق کے موقع پر جس دھوم دھام سے جلوس نکالا جاتا ہے وہ بھی ترکوں ہی کی نقل ہے بابر نے اپنی تزک کے صفحہ ۲۳۵ پر اس رسم کا ذکر کیا ہے اکبر نے اپنے بیٹے کی شادی میں سلیقی کی رسم کو نہایت پُر تکلف طریقے پر انجام دیا تھا اس جلوس میں آرائش کا نہایت قیمتی سامان تھا اس کے علاوہ ایک لاکھ روپیہ نقد بھی تھا۔ دربار کے امرا بھی جلوس کے ساتھ تھے ساچق کے بعد مہندی یعنی حنا بندی کا نمبر آتا ہے پھر شب گشت کا اس کے بعد کہیں سہرے کی نوبت آتی ہے۔

غالب اور ذوق سے پہلے اردو شعراء کے کسی دیوان میں کوئی نظم "سہرے" کی تہنیت اور مبارکباد کے طور پر نظر نہیں آتی، شادی پر قطعات ضرور نظم کئے گئے ہیں۔ مگر ان میں "سہرے" کی خصوصیت نہیں ہے نہ یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے ایسے قطعات اردو کے علاوہ فارسی میں بھی ہیں نعمت خان عالی نے ایک ہجویہ قطعہ کامگار خاں کی دوسری شادی پر نظم کیا تھا۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

بارِ دیگر کد خدا شد خانِ عالی منزلت   باکمال عزّ و تمکیں با وقار زیب و زین[1]

اس قطعہ میں نہایت فن کارانہ انداز میں میر جعفر دلدار کی ہجو کی گئی ہے اور اکثر علوم کی اصطلاحات صرف کر کے اسے اتنا مشکل بنا دیا گیا ہے کہ علامہ آزاد بلگرامی کو اس کی شرح لکھنے کی زحمت گوارا کرنا پڑی اس قطعہ میں بھی سہرے کا لفظ نہیں ملتا۔

اردو کے موجودہ مطبوعہ، ذخیرے کے پیش نظر یہ کہنا غالباً صحیح ہو گا کہ سب سے پہلے مرزا غالب نے سہرے کے نام سے ایک مستقل نظم بادشاہ کے ایماء پر لکھی، جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے۔

سہرہ لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر   دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

یہ تاریخی سہرا مرزا جواں بخت کی شادی پر لکھا گیا تھا جو شاہ ظفر کے بیٹے تھے اور نواب زینت محل کے بطن سے پیدا ہوئے تھے مقطع میں شاعرانہ تعلّی تھی اور اشارہ استادِ شاہ حضرت ذوق کی طرف تھا۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں   دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

بادشاہ کو خیال ہوا کہ غالب نے براہ راست ہم پر چوٹ کی ہے یعنی اس سے بہتر سہرا کہنے والا کوئی نہیں اور ہم نے ذوق کو ملک الشعراء بنا کر سخن فہمی اور مرتبہ شناسی کا ثبوت نہیں دیا۔ ذوق آئے تو بادشاہ نے سہرا دکھا کر کہا کہ آپ بھی سہرا کہیے اور ابھی کہیے۔ ذوق نے وہیں بیٹھ کر ۵ا شعر کا سہرا کہہ دیا اور مقطع میں غالب کی شاعرانہ تعلّی کا جواب بھی اسی رعونت اور اشاریت کے ساتھ دے دیا۔

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دے اس کو   دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ذوق کا سہرا اسی دن شہر بھر میں پھیل گیا اور دہلی کے ہر گلی کوچے میں گایا جانے لگا۔ غالب کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے معذرت کے طور پر ایک قطعہ لکھا سارا جھگڑا مقطع سے پیدا ہوا تھا۔ غالب اس کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں۔

مقطع میں آ پڑی تھی سخن گسترانہ بات   مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

اس کے بعد غالب اور ذوق کے اتباع میں سہرا کہنے کا رواج عام ہو گیا۔ جو اب تک موجود ہے لیکن بہر حال ہے بھلے کی ایک ترقی یافتہ شکل۔

[1] خزانہ عامرہ صہ ۳۳۵ دیوان عالی کے بعض نسخوں میں "عالی منزلت" کی جگہ "والا منزلت" مرقوم ہے اور یہی صحیح ہے۔

غالب اور ذوق کے سہروں کو دیکھ کر سہرے کے متعلق کچھ اور باتوں کا علم بھی ہوتا ہے مثلاً موتیوں کی لڑیوں کے ساتھ ہی سہرے میں پھولوں کی لڑیاں بھی ہوتی تھیں یا موتیوں اور پھولوں کے سہرے الگ الگ باندھے جاتے تھے۔

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز — چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

سہرے کی لمبائی قبا کے دامن سے نہیں بڑھتی تھی۔

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے — رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

سہرا کشتی میں رکھ کر لایا جاتا تھا۔

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی — ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

شادی کے موقع پر دستار تو باندھی ہی جاتی تھی اور اسی پر سہرا باندھا جاتا تھا لیکن ساتھ ہی سر پر طرہ بھی ہوتا تھا اور گلے میں بدھی نیز ہاتھ میں کنگن پہنائے جاتے تھے

سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی — کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منہ پر سہرا

بدھی اور کنگن ممکن ہے پھولوں ہی کے بنائے جاتے ہوں۔

سہرا گانے کا رواج تو سہاگنوں ہی کی ایجاد ہے مگر ڈومنیاں بھی گاتی تھیں۔

سہرے کی لڑی کا ٹوٹ جانا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کو بہت بُری فال خیال کیا جاتا تھا۔

ہو خیر دولھن دولھا کی ماتھا مرا ٹھنکا — اچھا نہیں بی ٹوٹنا سہرے کی لڑی کا[1]

---

[1] تاریخ ریختی معہ دیوان جان صاحب صفحہ ۷۶

محمود واجد — صنم پٹنہ

ایک خط، ایک افسانہ

(عصمت چغتائی کی باتیں)

شمو!

کل میں نے عارف سے تمہیں وہ خط بھجوا دیا تھا جس میں ایک مدیر نے تمہاری شان میں لکھا تھا۔ "وہ اگر اسی طرح لکھتی رہی تو ایک دن عصمت کی جگہ لے گی۔" جانے تم پر کیا رد عمل ہوا۔ ویسے عصمت ہونا اتنا مشکل نہیں جتنا "عصمت پن" کو برقرار رکھنا۔ آسکر وائلڈ نے بڑی بات کہی تھی۔ "تاریخ ہر کوئی بنا سکتا ہے لیکن صرف بڑا آدمی ہی اسے لکھ سکتا ہے۔" زیادہ دور نہیں، ماضی قریب میں جھانک کر دیکھو اردو افسانہ کی تاریخ میں کیسا سناٹا تھا۔ "قصہ طوطا مینا"، "الف لیلیٰ" اور "ہزار داستان" سے لیکر "فسانۂ آزاد"، "بنات النعش"، "امراؤ جان ادا" اور پھر "غبن"، تک ارتقائی کڑیاں ضرور تھیں۔ لیکن وہ "چھلانگ" نہیں تھی جو "انگارے" کی اشاعت نے لگائی اور ایسا لگا جیسے جو کچھ ہے وہ جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ پھر خاموش چیخیں ابھریں، دیکھتے دیکھتے ہی زور کا طوفان اٹھا اور بڑے بڑے تناور درخت خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے اور جو کچھ بچا وہ ایک نئی فضا تھی۔ نیا ماحول تھا، نئے ارادے تھے۔ پہلے زیر لب اور پھر ببانگ دہل کہا گیا۔ جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔ اور یہی اچھا ۱۹۳۶ کے افسانوی ادب میں "نئی بیداری" کا واضح سنگ میل بنا۔ عصمت اسی کی پیداوار ہیں۔ منٹو یہیں ملے، کرشن چندر، بیدی، سہیل عظیم آبادی، اختر حسین رائے پوری، حسن عسکری، احمد علی، حیات اللہ انصاری، ندیم قاسمی اور جانے کتنے خوشنما دھارے آ کر مل گئے۔ یہ سارے فنکار بنیادی مسائل پر سوچ رہے تھے۔ نئے انسان کے تھرتھراتے اور ڈگمگاتے قدم پرانی دھرتی پر جما رہے تھے گو ان کے نظریات جدا تھے اور مختلف سمتوں پر جا نکلے لیکن منزل ایک تھی۔ حقیقت کا ادراک اور اس کا فنی اظہار۔ اس میں کسی کا اسلوب تیکھا تھا کسی کا نرم، کسی کا کرخت تھا، کسی کا گداز! مجھے یاد ہے اس پسند پر تم سے بڑی طویل بحثیں ہوتی ہیں۔ مگر پسند کا کیا۔ کوئی اجمل پتھل راستوں سے گزرنا پسند کرتا ہے، کوئی خاموشی سے بہنا پسند کرتا ہے اور کوئی چنگھاڑ کر اترنا گرنا۔ رہے الفاظ جنہیں ہم فنی اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں تو ان کی حقیقت ویسی ہی ہے جیسے کھونٹیاں جن پر خیال و معنی کی وسعتیں پھیلا دی جاتی ہیں۔ ہاں اگر کھونٹی زنگ آلود ہو تو کپڑے کا سارا حسن داغدار ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ پچھلی بار تمہارے ایک افسانے کے ساتھ ہوا۔ میں نے اشارہ کیا تو تم برہم ہو گئیں پھر ہم سے مہینوں نہ ملیں اور طویل خاموشی کے بعد تم نے ایک افسانہ پوسٹ کیا تو جواب میری معرفت منگوایا۔ شمو! سچ مانو فنکاروں کو ان کی انا نے بڑا نقصان پہنچایا ہے ویسے پنپنے کے لئے یہ ضروری بھی ہے۔ فنکار کا اپنے فن کے ساتھ وہ رشتہ ہے جو زندگی کے ساتھ روح کا اگر یہ سچ ہے کہ فن خلا میں پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ زندگی کے بطن سے جنم لیتا ہے تو زندگی کے رخ پر لگے ہوئے خانے اور گرد کے نشانات

آئیں گے ہی۔ ویسے نانہ سے زیادہ گرد کے اثرات گہرے ہوتے ہیں۔ عصمت، ان گرد آلود چہروں کی نمائندہ ہیں جو معاشرہ کے ہاتھوں معتوب ہیں۔ کچلی اور روندی ہوئی زندگی، چیختی اور منہ بسورتی ہوئی مخلوق، معصیت اور شرمندگی سے بوجھل، اپنے آپ سے نالاں (گریزاں نہیں) ایک بہکی ہوئی آزاد عورت ہے۔ جو خدمت گار کا سہارا لیتی ہے۔ "تاریکی" کا پردہ چاک ہوتا ہے تو معصیت زدہ مرد سر جھکائے نظر آتے ہیں "جوانی" آتی ہے تو نچلے طبقے میں بے راہ روی لئے آتی ہے۔ ناپسندیدہ شادی کا نتیجہ "نفرت کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ "اپنی جڑیں" کھود کر انسانی تہذیب کھوکھلی نظر آتی ہے۔ "چھوئی موئی" بورژوا طبقے کے نسوانی تکلفات کی نمائندہ ہے جہیز کے بغیر ایک غریب گھرانے کی لڑکی کا چوتھی کا جوڑا اس کا کفن بن جاتا ہے "بہو بیٹیاں" میں نچلے درمیانی طبقے کی بہویں بیاہ کر نہیں آتیں بلکہ بیٹوں کو بیاہ کرنے جاتی ہیں۔ "دو ہاتھ" میں انسانی ہاتھ کی عظمت ہے۔ اس کے جائز ناجائز کا سوال نہیں ــــ یہ اور ایسی بے شمار تصویریں ہیں جو ہمارے معاشرے کا عکس ہیں۔ ہماری جبینیں پُر شکن ہو جاتی ہیں۔ اس میں آئینے کا کیا قصور! آئینہ والا تمہیں یاد ہوگا۔ گو کہ یہ یاد بھی تمہارے لئے عذاب سے کم نہیں ــــ تم کسی بات پر الجھ گئی تھیں۔ میں نے کہا ــــ "حضور یہ آئینہ" آئینہ تم نے دور پھینک دیا۔ بے چارے کا وجود کیا منتشر ہو گیا۔ تم کانچوں کو چننے بیٹھیں تو ہنس پڑیں۔ تمہارا وہی چہرہ ایک ریزہ میں بھی جھلک آیا تھا۔ فنکار کی نظر ایسی ہی ہوتی ہے۔ وہ کانچوں کو گنتے گنتے اپنا ہاتھ کٹا بیٹھتا ہے۔ لیکن کانچ کو جوڑ کر تصویر کا عکس ضرور دیکھ لیتا ہے۔!

عصمت کے یہاں ایک خاص بات بے پناہ سماجی بصیرت ہے جو قطرہ میں دجلہ دیکھنے سے نہیں چوکتی اور اسی بصیرت نے عصمت کو عظیم بنایا ہے ہنستے ہنستے رلا دینا وہ بھی اس طرح کہ محسوس نہ ہو انہیں کا کام ہے۔ اپنے مخصوص مشن میں وہ بڑی چابکدست نظر آتی ہیں۔ افسانوں میں سادگی اور پرکاری کوئی ان سے سیکھے چھوٹے چھوٹے جملے ہیں جو دلوں میں اتر جاتے ہیں وہ ان جملوں کی وساطت سے ہمیں سب کچھ کہہ جاتی ہیں لیکن ایسا لگتا ہے جیسے کچھ بھی نیا نہیں۔ کوئی انوکھا پن نہیں۔ بس سیدھی سادی باتیں ہیں، جسے ہم سب دیکھتے ہیں۔ ہم سب محسوس کرتے ہیں لیکن کہہ نہیں پاتے اس طرح نہیں سوچتے جیسے وہ سوچتی ہیں اور جب سب گرہیں کھل جاتی ہیں تو ایک سیدھی سی رسی رہ جاتی ہے جو ہر طرح مفید ہے جس سے ہر کام لیا جا سکتا ہے۔ یہی فنکار کی صناعی ہے اس کا حسن ہے اس کی ساحری ہے۔!

عصمت کے کردار سیدھے سادے ہوتے ہیں جو ہم آپ کے درمیان کہیں نہ کہیں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہر طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں اس کے موضوعات بڑے اہم ہیں۔ نفسیات کا اثر گہرا ضرور ہے لیکن وسعت اور ہمہ گیری ہمیں ان کا گرویدہ بنائے بنا نہیں چھوڑتا۔ انداز بیان شگفتہ بلکہ برجستہ ہے۔ زبان دھلی دھلائی اور شیریں ہے لیکن ان ظاہری پردوں کے پیچھے سنگین سماجی المیہ چھپا ہوتا ہے جیسے وہ کونین کی گولیوں کو شکر میں لپیٹ کر ہمیں پیش کر رہی ہوں اور ہم مزے کر کھالیں۔ لیکن کونین بہار ذہنیت پر اپنا اثر چھوڑ جاتی ہے۔!

ان تمام تکلفات کے باوجود عصمت عورت ہیں اور اسی طبقہ کی نمائندہ ــــ آپ تنگ نظری کہہ لیں لیکن یہ وسعت بھی تو ہے حق گوئی اور بے باکی کا پردہ چاک ہوتا ہے تو اس میں ایک دردمند اور حساس دل دھڑکتا دکھائی دیتا ہے جو مصائب کا مقابلہ کرتا ہے لیکن آلام کے ہاتھوں آٹھ آٹھ آنسو روتا بھی ہے، عورت جو ٹھہریں چنانچہ جب انھوں نے مردانہ وار قلم پکڑا تو بہتوں کو ان کی جنس مشکوک نظر آنے لگی اور تو اور منٹو جیسا اہل نظر بھی دھوکہ کھا گیا، خود لکھتا ہے۔ "جب میں نے "لحاف" کے اختتام کے متعلق سوال کیا تو وہ شرما گئی۔ میں نے کہا "دھت تیری، یہ بھی عورت ہی نکلی" عصمت کا یہی انداز پرانے ذہنوں کو کھل گیا۔ لیکن یہی رنگ بھی لایا اور آج عصمت کے کچھ افسانے اردو ادب میں اضافہ کی بات تو پرانی ہے، دنیا کے عظیم افسانوں کے مقابل رکھے جا سکتے ہیں۔ اردو ادب میں اور مکمل افسانے خال ہی خال ملتے ہیں عصمت کی سی مکمل انفرادیت منٹو کے یہاں ہو تو ہو ورنہ اور کہیں نظر نہیں آتی عصمت منٹو سے زیادہ سنبھلی ہوئی ہیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ عورت ذات زیادہ جذباتی ہوتی، زیادہ ڈگمگاتی، زیادہ قلابازیاں کھاتی۔ لیکن مردانہ باتوں کا شکار ہو گیا۔ ہو سکتا ہے عصمت کو ماحول زیادہ سازگار ملا ہو۔ لیکن یہ تو بہت کچھ اپنے سلیقے اور رکھ رکھاؤ پر ہے عصمت

ذہنی طور پر زیادہ صحتمند، زیادہ سنجیدہ ہیں بلکہ سیدھے سادے لفظوں میں یوں کہیے کہ بڑی پریکٹیکل ہیں۔ دل کی کمزوریاں کس کے ساتھ نہیں رہیں ان کے ساتھ بھی رہیں لیکن ذہن حاوی رہا یہ اور بات ہے کہ "ساقی" والوں کی سازش بھی کام کر رہی تھی عظیم روسی ادیب ترگنیف کے یہاں عورت کا بڑا صحت مند تصور ہے۔ عصمت مجھے ذاتی طور سے ویسی ہی تگڑی عورت نظر آتی ہے۔ چنانچہ منٹو کے لاابالی پن کو ایک نجی خط کے ذریعہ بڑے خوبصورت انداز میں انھوں نے ٹوکا ہے۔

"پاکستان کے آنے والوں سے آپ کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ کبھی اچھا، کبھی غنیمت کبھی برا۔ آپ سے انھیں قلابازیوں کی امید تھی —— بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز راہوں پر چلنے کے شوقین انسانوں کو شادی کرنے اور باپ بننے کا کوئی حق نہیں ——"

سچ بتاؤ شمو! کیا تم عصمت بن سکوگی؟ چھوٹی چھوٹی بات پر گھنٹوں رونے والی لڑکی دلگداز افسانے تو لکھ سکتی ہے عصمت نہیں بن سکتی۔ تم مجھے چھوڑنے کے لئے کہہ سکتی ہو۔ جو کچھ نہیں سکتے وہ تنقید کرتے ہیں۔ لیکن میری بھولی افسانہ نگار، تنقید بھی تو تخلیق ہے۔ تخلیق کی عظمت خلوص ہے۔ اور اسی خلوص سے میں نے کئی بار تمہیں جھنجھوڑا ہے۔ لیکن تم بیدار ہونے کے بجائے برہم ہوتی ہو —— سنا ہے تم اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے والی ہو۔ وقتی اذیت مجھے ہوگی لیکن میری تنقید سے وہ تنقید کی روشنی میں ہی تم تخلیق کروگی —— یہ مجھے یقین ہے جیسے تمہیں یقین تھا کہ تمہارا وہ افسانہ ہٹ کر جائے گا۔!

ایک زمانہ تھا کہ اردو افسانہ کے ایوان میں خواتین کی کوئی آواز نہیں تھی پھر ایک آواز گونجی اور چھا گئی پھر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ رشید جہاں، رضیہ سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ممتاز شیریں، صدیقہ بیگم، شکیلہ اختر، سرلا دیوی، کوشلیا اشک اور جانے کتنی ہیں۔ اب کارواں در کارواں ہے تو سالار کارواں دور کھڑا تماشا دیکھ رہا ہے۔ یہی شکایت اردو والوں کو عصمت سے رہی ہے۔ لیکن عصمت نے اس کا جواز اپنے بھائی منٹو کو بڑے پیارے انداز میں سمجھایا ہے —— "قلم کا کام تو آپ جانتے ہیں کہ کتنا لاگو قسم کا ہوتا ہے روگ کی طرح چمٹ جاتا ہے۔ بیس بائیس دن ہوئے تصویر ختم ہوئے۔ لیجئے اب دوسری شروع کیجئے۔ ایک روٹی توے پر دوسری کے لئے آٹا گوندھنا شروع کر دیجئے —— اور نہ توا خالی —— پیٹ خالی —— لہذا آٹے کی گندھائی جاری ہے آٹا پتلا ہوا تو گلگلے بن گئے۔ سخت ہوا تو ٹکیے! غرض سر گاڑی، پیر پہیے جتے ہوئے ہیں۔!"

ہماری شکایت ایک حد تک رفع ہو جاتی ہے لیکن اب بھی شکایت ناموں کا سلسلہ جاری ہے اور بجا طور پر ہماری توقعات اُن سے بہت ہیں۔ ظاہری چمک دمک اور فلمی زندگی کی جھلکیوں کے شوقین انسانوں کی کمی نہیں۔ آج کی مشغول ترین اور میکانکی زندگی میں فلم ہمارے وجود کا اہم حصہ ہے لیکن اس کی حقیقت عصمت سے سُنیئے۔

"یہاں تو بس سر پہ پکچر کا بھوت سوار ہے جو دال، روٹی، لحاف، توشک بنا ہوا ہے۔ بہت جی اُکتا گیا ہے کتنے لوگ ہوں گے جو اس لائن میں آنے کے شوقین ہوں گے لیکن شوق گلے کا ڈھول بن جائے تو پھر جی اُوب جاتا ہے۔ روٹی کمانے کے کتنے ذریعے ہیں کتابیں بھی بیچتے ہیں۔"

یہاں بھی عصمت نے اپنا مشن نہیں چھوڑا۔ وہ ایک خاموش پیغام دے جاتی ہیں۔ سماجی شعور کو وہ کس طرح بیدار کرتی ہیں یہ کچھ انہی کا حصہ ہے! اس لئے کل کی عصمت شمو! مجھے کہنے دو کہ تم مجھے نہ چاہو مجھ سے نہ ملو، عصمت کو چاہو عصمت سے ملو۔ ان کے فن کو گلے لگاؤ ان کی روایت کو آگے بڑھاؤ اور زمانے سے کہہ دو کہ کوئی شمو نہیں، کوئی اسے چاہنے والا نہیں، وہ کسی کو نہیں چاہتی، یہ فرضی باتیں ہیں۔ جو کچھ ہے عصمت کا فن ہے اس کا مطالعہ، ان کا تعارف ہے۔ ادھر قارئین اور خود عصمت ہیں جو فیصلہ کریں کہ میرا مطالعہ ادھورا ہے یا کیا ——!!

..QSH, KARACHI (PAKISTAN) REGD. NO. S. 1519